Title - WAHI ILAHI

Author - Saeed Ahmad Akbarabadi.

Publisher - Jayyed Barqi Press (Delhi).

Date - 1941.

Pages - 192.

Subjects -

سلسلہ ندوۃ المصنفین دہلی

(۱۱)

ہدیہ اخلاص و محبت از ناچیز مصنف
[illegible]
[illegible]

وحی الٰہی

History

تالیف

سعید احمد ایم اے

سلسلۂ ندوۃ المصنفین

(۱۱)

وحیِ الٰہی

مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب جس میں وحی کی لغوی اور شرعی حقیقت،
وحی کے اقسام، وحی کی حقیقت جدید فلاسفۂ مغرب کے نزدیک،
خدا کی صفتِ کلام، ملکۂ نبوت اور استعداد وحی، نزول وحی کی نوعیت و
کیفیت، قرآن مجید کے وحی الٰہی ہونے کے دلائل، اعجاز قرآن، وجوہ
اعجاز کی تنقیح، ان تمام عنوانوں پر بصیرت افروز کلام کیا گیا ہے

تالیف

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم اے

مینجر ندوۃ المصنفین کے اہتمام سے
جید برقی پریس دہلی میں طبع ہوئی

سنہ ۱۳۶۰ھ
۱۹۴۱ء

فہرست مضامین وحی الٰہی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دُنیا میں سینکڑوں سوالات ہیں جن کے جواب میں انسان سب کچھ کہنے کے بعد آخر ایک ایسے مرحلے پر پہونچتا ہے کہ پھر اُس کے لئے جواب کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ ہاتھی اس قدر فربہ اور توانا کیوں ہے؟ چیونٹی کیوں اتنی نحیف وزار ہے؟ آم کے درخت پر آم ہی کیوں لگتے ہیں جامنیں کیوں نہیں پیدا ہوتیں؛ غم سے رونا اور خوشی سے ہنسنا ہی کیوں آتا ہے۔ اس کا برعکس کیوں نہیں ہوتا؟ یہ اور اس طرح کے سینکڑوں سوالات ہیں جن کے جواب کا آخری مرتبہ یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کو اشیاء کے طبعی خواص اور اُن کے نوعی مخصّصات پر محمول کردیا جائے، پھر اگر اس کے بعد بھی یہ سوال کیا جائے کہ اس شئے کی یہ طبعی خاصیت کیوں ہے اور یہی کیوں ہے۔ کوئی اور چیز کیوں نہیں؟ تو اس کے جواب میں ایک ملحد کہے گا کہ مادہ کی ترکیب اسی طرح ہوئی ہے۔ لیکن موحد جواب دے گا کہ خدا نے ہر شئے کی صورتِ نوعیہ میں ایک الگ خاصیت رکھی ہے۔ جواب دونوں کے مختلف ہوں گے لیکن ہر ایک کا یہ جواب ایک آخری جواب ہوگا کہ اگر اس کے بعد بھی سائل "کیوں" سے سوال کرے تو اس کے جواب میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

وحی کا مسئلہ اسی طرح کے مسائل میں سے ہے۔ اس کی حقیقت کے سمجھانے میں ہم بتا سکتے ہیں کہ خدا کلام کرتا ہے۔ خاص خاص انسان (انبیاء) اُس کا کلام سنتے اور سمجھتے ہیں۔ اور ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ان دو دعووں پر جو عقلی اعتراضات کئے جائیں اُن کو رفع کردیں لیکن اس کے بعد بھی اگر کوئی

شخص "ایسا ہی کیوں ہوتا ہے" کہہ کر ہم سے سوال کریگا تو اُس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ اچھا پہلے تم ہمارے ہزاروں "کیوں" کا جواب دیدو۔ پھر ہم بھی تمھیں سمجھا دینگے کہ خدا انبیاء میں ہی کیوں کلام ربانی کو سمجھنے کی استعداد رکھتا ہے ہمہ شما میں کیوں یہ صلاحیت نہیں ہوتی۔

زیرِ نظر کتاب میں وحی الٰہی پر جو بحث کی گئی ہے اس کا مقصد انھیں سوالات کا جواب دینا ہے جو واقعی ایک طالبِ تحقیق کے دل میں اس مسئلہ پر غور کرنے کی راہ میں پیدا ہو سکتے ہیں ان کے علاوہ وہ لوگ جو ازراہِ بغض و عناد اپنے "کیوں" کا سلسلہ کہیں ختم ہی نہیں کرتے وہ اسکے مخاطب نہیں ہیں۔

ان اوراق میں کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی بیان کردہ حقیقتِ وحی کو عقلی اور نقلی حیثیت سے عام فہم اندازِ بیان کے ساتھ پیش کر دیا جائے۔ یہ کوشش کس حد تک کامیاب ہو سکی ہے؟ اس کا فیصلہ اربابِ نظر و خبر کرینگے واللّٰہ ھُوَ المُستعان وعلیہ التُکلان

سعید احمد اکبر آبادی

ندوۃ المصنفین دہلی

۳۱ر اگست ۱۹۴۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

وحی کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا۔ زیورِ علم وعقل سے آراستہ کیا۔ اور اس نے انسان کے جسمانی نشو ونما اور اس کی مادّی زندگی کی ترقی وفلاح کے لئے کارگاہ ہست و بود کو رنگ رنگ کے نقش ونگار سے سجایا اور ابنِ آدم کی تربیت وکامرانی کے لئے ایک مخصوص نظام کے ماتحت قطعی وحتمی وسائلِ معیشت پیدا کئے۔ چنانچہ وہ پانی پیتا ہے، ہوا میں سانس لیتا ہے۔ بادلوں سے بارش ہوتی ہے جو اس کے کھیتوں اور باغوں کو سرسبز وشاداب کردیتی ہے اور جس سے اناج اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔ آگ سے وہ اپنی غذا تیار کرتا ہے۔ آفتاب کی دھوپ سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں جن کی تخلیق میں انسان کی صنعت وحرفت کو کوئی دخل نہیں ان پر ہی حیاتِ انسانی کے قیام وبقا کا دارومدار ہے۔ یہ تمام اشیاء وہ ہیں جن کو مادّی زندگی کے قدرتی وسائل وذرائع کہا جاتا ہے، لیکن اس مادّی زندگی سے بڑھ کر انسان کی ایک اور زندگی ہے جس کو روحانی اور اخلاقی زندگی کہتے ہیں۔ اور اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ یہی وہ اصل حیات ہے جس پر انسان کی اجتماعی زندگی کا صالح اور درست نظام قائم رہ سکتا ہے اگر یہ نہ ہو تو انسان کی تمام تمدنی ترقیات۔ عمرانی ایجادات واختراعات، اور عقلی تحقیقات واکتشافات

انسانیت کی تعمیر میں مفید ثابت ہونے کے بجائے خود اُس کے لئے سم قاتل بن جائیں اور اُسکی سوسائٹیاں وحشیوں اور درندوں کے مہیب ریوڑ کی شکل میں تبدیل ہو کر رہ جائیں۔ جس طرح پورے نظام شمسی کے قیام و بقا کا دار و مدار اجرام فلکی کے باہمی جذب و انجذاب پر ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسانی سوسائٹی کے نظم و نسق اور اُس کی فلاح و نجاح کا انحصار حاسہ اخلاقی یا روحانی اعمال و ضوابط پر ہے[۵]۔

اس بنا پر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ رب العالمین جس نے انسان کی مادی و جسمانی زندگی کے قرار و قیام کا خود تکفل کیا۔ اُس کے لئے ایسے قدرتی وسائل و ذرائع پیدا کئے جن کی صنعت و تخلیق میں انسان کے اپنے دستِ ایجاد کو مطلقاً دخل نہیں ہے۔ وہ ہمیں اخلاقی اور روحانی زندگی کے ایسے قدرتی اصول و آئین نہ بتاتا جو صالح تمدن کے اساس و بنیاد بنیں اور جو قطعی و حتمی ہونے کی وجہ سے ہر ملک اور ہر زمانہ میں ہر شخص کے لئے لائقِ عمل اور درخورِ قبول و پذیرائی ہوں۔ اور اُن میں کسی کے لئے اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔

عقل کی کوتاہی

کہا جا سکتا ہے اس طرح کے اصول و ضوابط کے لئے یہ کیا ضروری ہے کہ وہ خدا کے بنائے ہوئے ہوں۔ اور اُس نے ہی انسان کو اُن کی تلقین کی ہو۔ جس طرح انسان اپنے رہنے کے لئے مکانات بناتا ہے۔ گرمی سردی سے محفوظ رہنے کی غرض سے اپنے لئے کپڑے بنتا اور تیار کرتا ہے اور اسی طرح کی ہزاروں صنعتیں اُس نے اپنے نفع کے لئے ایجاد کر رکھی ہیں، وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ اپنے لئے اخلاقی ضوابط و قواعد بنائے اور اپنی روحانی تشنگی کو فرو کرنے کے لئے خود ہی کوئی نسخۂ کیمیا تجویز کر لے۔ عقل جس طرح مادی ترقی کی راہ میں رہنمائی کرتی ہے، اخلاق اور روحانیت کے میدان میں بھی وہ اسی طرح شمعِ ہدایت

---

[۵] ڈاکٹر اقبال مرحوم نے یورپ کی عقلی ترقیات کا اسی بنا پر نہایت بلیغ پیرایہ میں ماتم کیا ہے کہ وہاں ان سب ترقیوں کے باوجود اخلاق و روحانیت کا فقدان ہے اور اس لئے انسانی زندگی کا شیرازۂ اطمینان و سکون حد درجہ پراگندہ و پریشان ہے۔ فرماتے ہیں:-

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا　　زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا　　اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

بن سکتی اور اُس کا ناخن تدبیر دونوں جگہ مشکل اور پیچیدہ مسائل کی گرہ کشائی میں کارگر ثابت ہوسکتا ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ کسی انسان کی عقل کتنی ہی کامل و مکمل ہو نقص سے مبرا نہیں ہوسکتی۔ انسان خود اپنی فطرت و طبیعت کے اعتبار سے ناقص و غیر مکمل ہے۔ اس بنا پر اُس کی کوئی قوت بھی خواہ ظاہری ہو یا باطنی، مادی ہو یا روحانی، من کل الوجوہ کامل نہیں ہے۔ ہر معاملہ میں صحت کے ساتھ خطا، کمال کے ساتھ نقص، اور تذکر کے ساتھ سہو و نسیان کا خدشہ لگا ہوا ہے۔ اور کیوں نہ ہو، امکان و حدوث کی ظلمت کے ساتھ کمالِ بے خطا کا زعم کس طرح ہوسکتا ہے۔ جس طرح انسان رنگ اور شکل میں ایک دوسرے سے متبائن ہیں ٹھیک اسی طرح اپنے قوائے فکریہ و باطنیہ کے لحاظ سے بھی وہ مختلف اور ایک دوسرے سے جُدا ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی خوش نصیب عقل حقیقت کے بحرِ ناپیدا کنار میں غوطہ زنی کر کے صداقت و حقانیت کے چند آبدار موتی حاصل کرلے لیکن اُس کے پاس وہ قوت کہاں ہے جس سے وہ تمام دنیا کو اُس صداقت کا معترف بنا سکے۔ کوئی انسانی اختراع و ایجاد خواہ کتنی ہی حقیقت سے قریب ہو، اختلاف کی گنجائش سے خالی نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ عوام کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ آج تک دنیا کی ممتاز عقلیں بھی کسی ایک مسئلہ پر متفق الرائے نہ ہوسکیں فلسفۂ یونان کے جو بنیادی نظریے تھے اور جو قرنہا قرن تک عالم میں مقبول و رائج رہے، آخر آج موجودہ فلسفۂ یورپ نے اُن کو پرزہ پرزہ کر کے فضا میں منتشر کر دیا ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ آج فلسفۂ حال کی عمارت جس بنیاد پر کھڑی ہے مستقبل میں کوئی قوم اپنے جدید نظریات و افکار کی قوت سے اُسے پاش پاش نہیں کر دیگی اور اُس عمارت کے کھنڈروں پر ایک نئے نظامِ فکر و عمل کی دنیا نہیں بسائیگی۔ قرنوں اور صدیوں کے بعد جو کچھ ہوگا اُسے تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن اتنا تو اب بھی دیکھا جا رہا ہے کہ فلسفۂ جدیدہ کی شاندار عمارت کو ارتیاب و شک کا گھن ابھی سے لگنا شروع ہوگیا ہے۔ مولانا عبدالباری ندوی استاذ فلسفۂ جدیدہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن "فہم انسانی" کے مقدمہ میں اس رازِ سربستہ کا افشا اس طرح کرتے ہیں۔

"اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد جدید فلسفہ کی تاریخ زیادہ تر نام بدل بدل کر کھلے یا چھپے انزاجیل

کی تاریخ بن کر رہ گئی۔ لاک کے یہاں یہ اقرار حسیت کے نقاب میں ہے اور برکلے کے ہاں دعائے تصوریت کے، مگر اتنی باریک اور شفاف کہ روپوشی سے زیادہ رونمائی کی زینت ہے، آخر برکلے کے بعد ہی ڈیوڈ ہیوم نے اس رونما نقاب کو بھی تار تار کر دیا اور نہ صرف جہل و ارتیابیت کا کھل کر اقرار کیا بلکہ اپنے کو ارتیابی ہی کہلانا پسند کیا۔

فلاسفہ کا اعتراف عجز و نارسائی | عقلِ انسانی کی کوتاہی اور اس کے عجز و قصور کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ وہ عظیم المرتبت فلاسفہ عالم جن کے فلسفیانہ افکار و نظریات عقل و فکر کی تاریخ ارتقا کا آخری نقطۂ عروج مانے جاتے رہے ہیں۔ جب عالم حقیقت کی لامحدود وسعتوں میں انھیں قدم قدم پر حیرت و گمشدگی سے سابقہ پڑا تو خود انھیں بھی بجز اس کے کوئی اور چارہ کار نہ تھا کہ وہ برملا عقل کی کوتاہ بینی اور فکر کی نارسائی کا اعتراف کریں سقراط کا یہ مقولہ حد تواتر تک مشہور ہے "ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے"۔ انگلستان کا مشہور فلسفی ڈیوڈ ہیوم صاف لفظوں میں اقرار کرتا ہے کہ

"انسان عقل مخلوق ہے، اور اس لحاظ سے علم اس کی خاص دماغی غذا ہے لیکن ساتھ ہی انسانی ذہن عقل و فہم کے حدود اتنے تنگ ہیں کہ اس باب میں اس کو وسعت و اذعان دونوں حیثیات سے بہت ہی کم اپنے فتوحات سے تشفی نصیب ہو سکتی ہے"

"فہم انسانی" میں ہی ایک اور جگہ فلسفہ کا اس طرح مذاق اڑاتا ہے۔

"مکمل سے مکمل فلسفۂ طبعی بھی صرف یہ کرتا ہے کہ ہمارے جہل کو ذرا اور دور کر دیتا ہے، جس طرح مکمل سے مکمل فلسفہ مابعد الطبیعات اور اخلاقیات کا صرف یہ کام ہوتا ہے کہ ہمارے اس جہل کے وسیع حصوں کی پردہ دری کر دیتا ہے، مطلب یہ ہے کہ فلسفہ اسرارِ کائنات کی نہیں صرف ہمارے جہل کی پردہ دری کرتا ہے۔ اس کا حاصل اگر کچھ تھا یا ہو سکتا ہے تو انسان کی کمزوری اور کورچشمی کا تماشا دیکھنا دکھانا جس سے بھاگنے کی کوشش کے باوجود بار بار

دوچار ہونا پڑتا ہے"

ہیوم تو خیر ارتیابی تھا۔ ہر چیز کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا، مادہ پرستوں کا ابوالآبا، دیمقراطیس (متولد سنہ ۴۶۰ ق م) تک کا قول ہے کہ کوئی بات سچ نہیں اور اگر ہے تو ہم کو معلوم نہیں[1]۔

پس جب عقل خود ناقص ہے تو کسی صحیح نتیجہ تک پہونچنے کے لئے جو ذرائع اختیار کئے جائیں گے یعنی قیاس، استقراء، اور تمثیل اُن کی نسبت کیونکر بوثوق کہا جاسکتا ہے کہ وہ کسی صحیح اور یقینی نتیجہ تک ہماری رہنمائی کرسکتے ہیں

یہ ظاہر ہے کہ کسی چیز کے یقینی علم کے لئے مشاہدہ سے بڑھ کر کوئی اور قوی دلیل نہیں ہوسکتی۔ لیکن آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ قدیم فلاسفہ میں تو لاادریہ کا ایک مستقل گروہ تھا ہی جو کہا کرتا تھا کہ ہمیں کسی شئے کی کوئی حقیقت معلوم نہیں۔ یورپ کے جدید فلاسفہ کی صف میں بھی برکلے جیسے فلسفی نظر آتے ہیں جو کہتے ہیں کہ کسی شئے کا وجود صرف وہی ہے جو ذہن میں ہے اس کے علاوہ وجود خارجی کے کوئی معنی نہیں۔ اس سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان فلاسفہ نے جو کچھ کہا وہ ٹھیک ہے۔ بلکہ مدعا صرف یہ دکھانا ہے کہ اگر عقل کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور خدا کی ہدایت اُس کی دستگیری نہ کرے تو خود اُس کی کوششیں لبسا اوقات فرطِ حیرت کی ناکامی و مایوسی پر منتہی ہوتی ہیں اور ادراکِ حقیقت کی کسی روشنی تک پہونچنے کے بجائے وہ لاعلمی و نادانی کی تاریکیوں میں خود اپنے آپ کو بھی گم کر دیتی ہے۔

اس موقع پر اتنی بات اور یاد رکھنی چاہئے کہ جب طبیعات میں عقل کی کوتاہ رسی کا یہ عالم ہے کہ وہ قطعی طور پر کسی چیز کی ذاتیات اور عرضیات میں بھی امتیاز نہیں کرسکتی اور اسی بنا پر ارباب منطق تسلیم

---

[1] یہاں یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ اس باب میں جن فلاسفہ کے اقوال نقل کئے گئے ہیں وہ سب فہم انسانی سے ماخوذ ہیں جو پروفیسر عبدالباری ندوی کے قلم سے ڈیوڈ ہیوم کی کتاب ہیومن انڈرسٹینڈنگ کا نہایت عمدہ ترجمہ ہے اس کے علاوہ موصوف کی دو اور کتابیں "برکلے" اور "مبادی علم انسانی" جو برکلے کی کتاب کا ترجمہ ہے یہ دونوں بھی پیش نظر رہی ہیں۔

کراتے ہیں کہ کسی چیز کی بھی حدِ تام بیان کرنی ناممکن ہے، تو ظاہر ہے مابعد الطبیعات میں اُس کی تنگ پائی کا کیا حال ہوگا۔ اور چونکہ فضائل اخلاق اور روحانی کمالات کا تعلق ایک بڑی حد تک حقائق مابعد الطبیعات کے تصور سے ہے۔ اس لئے عقل اس راہ میں ہماری کامیاب رہنما ثابت نہیں ہوسکتی اور نہ ہم اُس پر اعتمادِ کُلی کرسکتے ہیں۔

عقل اور دل

اس مقام پر مزید توضیح وتشریح کی غرض سے اتنا اور یاد رکھئے کہ انسان کو جتنے معاملات پیش آتے ہیں، اُن کا تعلق صرف عقل سے ہوتا ہے یا فقط دل سے۔ اور یا دونوں سے اور یہ واقعہ ہو کہ انسانی زندگی کا قیام وبقا، اور اُس کی روحانی واخلاقی دنیا کا نظم ونسق مبنی ہے اس بات پر کہ انسان عقل اور دل دونوں سے کام لے، کیونکہ جس طرح عقل مصدرِ شعور واحساس ہے۔ اسی طرح جذبات وعواطف کا سرچشمہ ہو اگر ہم عقل (Reason) کے ہی تابع فرمان ہوجائیں اور دل (Feeling) کو ہم پر کوئی دسترس حاصل نہ ہو تو ہم اُس فلسفی کی طرح ہوکر رہ جائیں گے جس کو شادی میں غم۔ اور غم میں شادی کی تصویر نظر آتی ہے اور جو اپنی ہستی کے قطرہ کو وجودِ ابدی کے بحرِ ناپیدا کنار میں فنا کردینے کے بعد ہر قسم کے فعل وعمل سے آزاد ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم عقل سے بالکل صرفِ نظر کرلیں اور اپنے تمام معاملات اور افعال واعمال دل کے میلانات وعواطف کے تابع بنالیں تو اس کا انجام بھی بجز تباہی کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ اس وقت ہماری مثال انتہائی عیش پرست اور ظالم وجابر انسان کی سی ہوگی۔ یا پرلے درجہ کے مغلوب الجذبات نرم خو اور دل گیر شخص کی سی۔ غرض یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں خیالات واحساسات کا توازن مفقود ہوکر انسانی اجتماعیات کے شیرازہ کو درہم برہم کرکے رکھ دیگا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ دونوں میں ارتباط والتیام ملحوظ رکھا جائے۔ لیکن محبت کے عام نفسیاتی قانون کے مطابق دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے کی طرف نسبتہً زیادہ مائل ہونا چاہئے۔ اس مرحلہ پر ہمارا دعویٰ ہے کہ عقل کو ایک بڑی حد تک ،، ادب خوردہ دل،، ہونے کی ضرورت ہے جیسا کہ پہلے معلوم ہوچکا ہے عقلِ محض کی رہنمائی ہمارے لئے کشودِ کار کا قابلِ اطمینان ذریعہ نہیں۔ البتہ وہ عقل جو علامہ اقبال مرحوم کے

بقول "ادب خوردگی دل" کے زیور سے آراستہ ہے وہ ہماری روحانی تشنگی کو فرو کرنے کا بہت کچھ سامان رکھتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل ست — نقشے کہ بستہ ہمہ اوہام باطل ست

ذیل کے شعر میں بھی انھوں نے اسی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔

جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے — یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار

فلسفہ اشراق جن لوگوں نے تاریخ فلسفہ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جب مسیحیت اور فلسفۂ محض دونوں انسان کی روحانی تشنگی کے فرو کرنے میں ناکام ثابت ہوئے جس کی وجہ یہ تھی کہ مسیحیت عقل کو مطمئن کرنے میں ناکامیاب رہی۔ اور فلسفہ روح اور دل کے لئے کوئی سامانِ تسکین فراہم نہیں کرسکا۔ تو افلاطون کے متبعین نے فلسفہ اور مذہب دونوں کی آمیزش سے ایک معجون مرکب تیار کی جسکا نام فلسفۂ اشراق (Neo-Platonism) رکھا گیا۔[1] اس کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ طبیعیاتی مسائل ومباحث کے ساتھ ساتھ اخلاقیات اور الٰہیات اور روحانیت کے مسائل بھی اس میں شامل تھے۔ فلسفہ کے اس نئے اسکول کا بانی فلاطینس (Plotinus) تھا جو ۲۰۴ء میں مصر میں پیدا ہوا، اور ۲۷۰ء میں روم میں انتقال کر گیا۔

اسباب وعلل خواہ کچھ بھی ہوں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس فلسفہ کو مشرق میں اور مغرب میں دونوں جگہ بہت فروغ ہوا اور غالبًا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ایشیا کے دل ودماغ پر تو اس فلسفہ کا اتنا زبردست استیلاء ہوا کہ مذہبی عقائد کی مضبوط بنیادیں تک متزلزل ہوگئیں۔ لیکن چونکہ اس فلسفہ کا تمام تاروپود عقل کی موشگافیوں سے ہی تیار ہوا تھا اور اگرچہ اس میں ضمیر (کانشنس) کی پکار کو بھی دخل تھا، لیکن وہ مغلوب تھی۔ اور غلبہ عقل کو ہی تھا۔ اس لئے معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کے میدان میں انھیں قدم قدم پر ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ اور یہ رہ نوردانِ حکمت ودانائی جانفروشانہ تگ ودو کے بعد بھی اس سرچشمۂ ہدایت تک نہ پہونچ سکے جو روح اور دل کے

---

[1] فلسفۂ اشراق پر مفصل معلومات کے لئے دیکھو Encyclopaedia of Religion & Ethics V.9, pp: 307 - 319.

لئے واحد سرمایۂ تسکین ہے۔

فلسفۂ اشراق خدا کو مانتا ہی نہیں، بلکہ وہ اس کو تمام کائنات میں جاری و ساری مانتا ہو اُسکے نزدیک خدا منبع خیر ہے۔ اور مادہ مخزنِ شر و ظلمات، اُس کے اذعان و یقین میں خدا حقیقتِ واحدہ ہے اور انسانی روح اُس کا پرتو، اس عقیدہ کے ساتھ ساتھ فلسفۂ اشراق روحانیت، اخلاق، تزکیۂ باطن، اور تصفیۂ نفس کی طرف بھی دعوت دیتا ہے اور انسان کو لذائذِ جسمانی ترک کر کے تقویٰ و طہارت کی زندگی بسر کرنے پر اُبھارتا ہے یہ سب کچھ سہی لیکن اصل یہ ہے کہ چونکہ اس فلسفہ کی بنیاد کسی خدائی قانون (وحی الہی) پر نہیں تھی۔ اور یہ محض عقل کی لاٹھی کے سہارے کھڑا ہوا تھا۔ اس بنا پر خود خدا کی صفات و ذات کی نسبت اس فلسفہ نے ایسی موشگافیاں کیں کہ اُنھوں نے انسان کی روح کو دلاسا دینے کے بجائے اسے ایک اور ہولناک ورطۂ حیرت و تذبذب میں پھنسا دیا مثلاً اس فلسفہ نے بتایا کہ۔

(۱) خدا علۃ العلل ہے۔ اور چونکہ علۃ تامہ سے معلول کا صدور بالاختیار والارادہ نہیں ہوتا بلکہ بالاضطرار ہوتا ہے اس لئے عالم کی تخلیق بھی خدا سے اضطراراً ہوئی ہے، اس میں اُس کی مشیت اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں، اس کی مثال بالکل آگ کی سی ہے کہ جب وہ پائی جائیگی تو حرارت پیدا ہو گی ہی، خواہ آگ کے لئے ارادہ ہو یا نہ ہو۔

(۲) خدا کی ذات اس قدر ارفع و اعلیٰ ہے کہ ہم اُس کی طرف کسی صفت مثلاً علم، ارادہ، اور خیر کا بھی انتساب نہیں کر سکتے، حد یہ ہے کہ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ وجود رکھتا ہے۔ کیونکہ ہر موجود کا تصور ممکن ہے اور خدا کا تصور ہو ہی نہیں سکتا (لَا یُحَدُّ وَلَا یُتَصَوَّرُ)

(۳) انسان کی روح اگر حسی لذتوں میں مبتلا رہے گی تو وہ قالب بدلتی رہے گی خواہ وہ کسی انسان کا ہو یا حیوان کا یا نباتات کا۔

غرض یہ ہے کہ اس فلسفہ نے کہیں در پردہ لا ادریت کی تلقین کی اور کہیں دیدانت فلسفہ کے

دیکھا دیکھی تناسخ کا اقرار کیا۔ یہ لوگ چلے تھے حق کی تلاش میں، لیکن جب عقلِ محض کی قیادت راہِ طلب کی جانگسل صعوبتوں کی حریف نہ بن سکی، تو انجام کار حضرتِ موسٰی کی قوم کی طرح خود اپنے وجود کو بھی وادیِ حیرت میں گم کر کے بیٹھ رہے۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ یہ فلسفہ روحانیت اور اخلاق کے چند در چند مواعظ حسنہ کے باوجود تمام دنیا کا تو کیا ذکر ہے، کسی ایک انسانی سوسائٹی میں بھی عظیم الشان روحانی و اخلاقی انقلاب پیدا نہیں کر سکا، بلکہ حق تو یہ ہے کہ اس فلسفہ نے انسان کو دماغی بلند پروازیوں میں مشغول کر کے اسے عملی جد و جہد سے محروم کر دیا۔ اور اس کی عملی قوتوں کو اس درجہ مضمحل بنا دیا کہ وہ تقریباً از کار رفتہ ہو کر رہ گئیں۔ مرزا غالب نے شاید اسی قسم کے لوگوں کی نسبت کہا ہے۔

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت   دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

موجباتِ تسکین و یقین عقل منطق اور فلسفہ ان سب دروازوں سے مایوس لوٹنے کے بعد پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اچھا بتاؤ اطمینان و سکون کا وہ خزانہ کہاں ہے جو انسانیت کی روحانی طلب کو سکون عطا کر سکے قبل اس کے کہ آپ اس کا جواب معلوم کریں، یہ جان لینا ضروری ہے کہ یقین کی ماہیت کیا ہے؟ اور یہ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟

کم و بیش تمام علمائے نفسیات نے یقین کی ماہیت اور اس کے اسباب و علل پر بحث کی ہو لیکن نفس یقین کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں ہو بلکہ اسکی مختلف قسمیں ہیں مثلاً منطقی یقین (Logical Certainty) نفسیاتی یقین (Psychological Certainty) اور مذہبی یقین (Religious Certainty) اور یقین کا تحقق انھیں اقسام میں سے کسی ایک قسم کے ضمن میں ہوتا ہے، ان اقسام کی تعریفیں جدا جدا ہیں لیکن ان سب میں مابہ الاشتراک یہ ہے کہ یقین ایک طرح کا نفسی میلان ہے جو خاص خاص موثراتِ خارجی و ذہنی کے زیر اثر انسان کے قلب میں پیدا ہو جاتا ہے[1]۔ اس نفسی میلان کو پیدا کرنے کے لئے نہ فلسفیانہ اور منطقی

---

[1] تفصیلی معلومات کے لئے دیکھو Encyclopaedia of Religion & Ethics V.III pp.320-330

دلائل کی ضرورت ہے۔ اور نہ ریاضی و اقلیدس کی بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ میلان نہ علم پر موقوف ہے اور نہ جہل پر۔ اس کا انحصار نہ سچ پر ہے اور نہ جھوٹ پر۔ فرض کیجئے ایک ڈاکٹر ہے جسے آپ جانتے ہیں کہ اس نے اب تک جتنے علاج بھی کئے ہیں اُن میں وہ ناکام رہا ہے۔ اس بنا پر اگر آپ کا کوئی عزیز بیمار ہو جائے تو چونکہ آپ کو اس ڈاکٹر کی نالائقی کا یقین ہے، اس لئے اگر کوئی شخص آپ کو اس ڈاکٹر کے علاج کا مشورہ دیگا بھی تو آپ فوراً انکار کر دینگے لیکن آپ کے برخلاف ایک اور شخص ہے جو کم از کم ڈاکٹر موصوف کے مین کامیاب علاجوں کا مشاہدہ خود اپنی آنکھ سے کر چکا ہے۔ اس لئے اگر آپ اپنے مریضِ عزیز کے علاج سے متعلق اس شخص سے مشورہ کرینگے تو وہ بے تامل و تردد کہے گا کہ اسی ڈاکٹر سے رجوع کیجئے کیونکہ اُسے اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدہ کے باعث ڈاکٹر کی قابلیت و مہارتِ فن کا ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ آپ کو ڈاکٹر کی عدمِ قابلیت کا۔ اس مثال سے واضح ہوا ہوگا کہ یہاں ڈاکٹر کی قابلیت کی نسبت شخص مذکور کا نفسی میلان (یقین) اُس کے تجربہ پر مبنی ہے۔

اب اس کے بعد اس پر غور کیجئے کہ تجربہ کبھی مسلسل مشاہدہ سے پیدا ہوتا ہے اور کبھی محض ذوق و وجدان سے۔ آپ نے اُردو شاعری میں رندِ بادہ خوار اور زاہدِ تقویٰ شعار کی نوک جھونک دیکھی ہوگی۔ دیکھئے زاہد شراب کی بُرائی کا یقین رکھتا ہے لیکن اس کے برعکس رندِ بادہ آشام کو شراب کی جانفروزی کا اس درجہ یقین ہے کہ وہ دعوی سے کہتا ہے:۔

جاں فزا ہی بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا　　　سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

پھر زاہد اُسکے اس یقین کو توڑنے کے لئے دلائل و براہین پیش کرتا ہے تو وہ ان کے جواب میں صرف اتنا کہتا ہے ع

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

غرض یہ ہے کہ یقین جس کی حقیقت ایک نفسی میلان کے سوا اور کچھ نہیں ہے مختلف جذبات قلبی کیفیات

کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس بنا پر کوئی ایک شخص کسی دوسرے کو اس لئے مطعون نہیں کرسکتا کہ وہ کسی چیز کی نسبت اُس کی طرح یقین و اذعان کیوں نہیں رکھتا ہاں لعن وطعن اور ملامت اگر ہوسکتی ہے تو وہ محض اس بات پر ہوسکتی ہے کہ اُس دوسرے شخص کے دل میں وہ کیفیت کیوں پیدا نہیں ہوتی جس کی وجہ سے دل میں اُس چیز کی نسبت نفسی میلان پیدا ہوتا، چنانچہ قرآن مجید نے اُن کفار کے متعلق جو کلمۂ حق قبول نہیں کرتے تھے۔ یہ نہیں کہا کہ انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کے وحی ہونے کا یقین کیوں نہیں آتا بلکہ

خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ — اللہ نے اُن کے دلوں اور اُن کے کانوں پر مہر لگادی
وَعَلٰی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ (بقرہ) — ہے اور اُن کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

فرماکر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان لوگوں میں فطرتاً اتنی صلاحیت و استعداد ہی نہیں کہ اُن کے دل میں آنحضرت اور قرآن کی حقانیت و صداقت کے متعلق نفسی میلان پیدا ہو۔

اس تقریر سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ یقین بذات خود کوئی مستقل چیز نہیں بلکہ وہ ثمرہ ہوتا ہے ایک خاص طرح کے طبعی و قلبی جذبات و تاثرات کا، اب اس مقدمہ کو ذہن نشین کرکے آپ غور کرینگے تو بیّن طور پر محسوس ہوگا کہ وحی الٰہی انسان کے دل میں جس طرح اطمینان و سکون پیدا کردیتی ہے وہ بالکل ایک نفسیاتی طریقہ ہے اور اس لئے انسان اس پیغام ربانی کو سُن کر اُس شک و تردد سے دوچار نہیں ہوتا جس کا سبب بالعموم منطقی طرزِ بحث و استدلال ہوتا ہے۔

مثلاً اگر اُس کو یہ بتانا ہے کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے تو وہ اس سے بحث نہیں کرتا کہ خدا کلام کرتا ہے یا نہیں؟ اور اگر کرتا ہے تو کس طرح؟ کیا اُس کے لئے نطق پایا جاسکتا ہے؟ کیا نطق کے لئے عضلات و اعصاب کی ضرورت نہیں ہے؟ جبریل رسول اللہ کے قلب پر کلامِ خداوندی کا القار کرتے ہیں تو کس طرح؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ وہ جانتا تھا کہ یہ مابعد الطبیعیاتی حقائق ہیں جن کی گرہ کشائی آج تک نہ کسی عقل

سکے ناخن تدبیر نے کی ہے اور نہ کر سکے، جب مشاہدات اور محسوسات کی دنیا میں ہی قدم قدم پر ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں تو پھر عالم مجردات و معقولات کی وسعتیں کس طرح انسان کی محدود عقل میں سمٹ سمٹا کر جمع ہو سکتی ہیں، اسلئے قرآن نے اس طریقۂ بحث و استدلال کو چھوڑ کر ایک بالکل نفسیاتی اور بہت زیادہ موثر طریقہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اور دعوت دی کہ تم آپ کے ایک ایک عمل اور ایک ایک حرکت و سکون کو نہایت گہری تنقیدی مگر انصاف اور عدل کی نگاہ سے دیکھو۔ اسے جانچو، پرکھو اور بتاؤ کہ کیا تم نے کبھی اُس ذات گرامی کو جھوٹ بولتے دیکھا ہے؟ کیا تمھیں کبھی ان کی کوئی حرکت مشتبہ نظر آئی ہے؟ کیا اُن کے کسی فعل و قول پر بھی تمھیں کبھی حرف گیری کا موقع ملا ہے؟ اگر ان سب باتوں کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو یقین کرو کہ جس ذات نے عمر کا بہترین حصہ (۴۰ سال) اس تقویٰ و طہارت، معصومیت، اور فضائل اخلاق کے ساتھ بسر کئے ہیں وہ آج بھی جھوٹ نہیں بول سکتا اور آج بھی اُس کی زبانِ حق ترجمان کسی نا ملائم اور نادرست بات سے آشنا نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پر چڑھ کر پہلی مرتبہ قریش کو دعوت اسلام دی تو یہی طریقہ اختیار کیا کہ اُن سے پوچھا، بتاؤ! تم مجھ کو کیا سمجھتے ہو؟ جب سب نے بیک آواز اقرار کر لیا کہ، آپ امین صادق ہیں آپ نے آج تک کوئی بات جھوٹ نہیں کہی، تو پھر آپ نے اُن تک اسلام کا پیغام جانفزا پہونچایا اور خود قرآن بھی سید کونین کی زبان اقدس سے یوں گویا ہوتا ہے۔

قَدْ لَبِثْتُ فِیکُمْ عُمُراً مِنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (یونس) — میں نے تو تمہارے درمیان مدت تک عمر گذاری ہے کیا تم پھر بھی نہیں سمجھتے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وحی الٰہی پیغمبر کو ایک فاضل و کامل معلم یا ایک شفیق و عقلمند باپ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور انسان کے کانشنس یا اسکے ضمیر و وجدان Inner Feeling سے اپیل کرتی ہے کہ جس طرح شاگرد وجدانی طور سے اُستاد پر اور بیٹا باپ پر اعتماد کُلّی رکھتا ہے اور اسلئے

اُستاد کی تعلیمات اور باپ کی نصیحتوں کو شک وشبہ کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ اسی طرح تمام دنیا کو پیغمبر کی ذات پر اعتماد رکھنا چاہیئے اور اس کی تعلیمات و ہدایات کو گوشِ حقیقت نیوش سے سنکر حرزِ دل و جان بنا لینا چاہیئے۔

پس یہ ثابت ہو گیا کہ اصل صداقت و حقانیت اور کامل اطمینان و سکون کا سراغ صرف وحیِ الٰہی کے ذریعہ ہی مل سکتا ہے اور انسان کی روحانی تشنگی صرف اسی سرچشمۂ ہدایت کے آبِ زلال سے بجھ سکتی ہے۔ اللہ بس باقی ہوس۔ "مذہبی دیوانوں" کا کیا ذکر ہے، خود اُن لوگوں نے جو کرۂ فلسفہ کی سب سے اونچی سطح پر نظر آتے ہیں اس حقیقت کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔

"ہم کو حصولِ صداقت سے مایوس ہو جانا چاہیئے بجز اس صورت کے کہ ہم یہ مان لیں کہ اس کا علم براہ راست خود اسی ذات کی طرف سے عطا ہوتا ہے جو اس کا ابدی سرچشمہ ہے، یعنی خود خدا کی طرف سے، اور یہی وہ آخری حل تھا جو نو فلاطینیوں نے اختیار کیا اور جس کو ارتیابیت نے ناگزیر کر دیا تھا۔ علمی تفکر کی راہ سے حصولِ یقین کی مایوسی ہی اس پر مجبور کر سکتی تھی کہ صداقت کو وحی کے اندر پانے کی کوشش کی جائے جو فکر سے بالاتر ہے"[۱]

ایک اور فلسفی کہتا ہے۔

"انسان کے پاس کوئی یقینی علم نہیں، ہاں خدا کے پاس ہے۔ اور مدعی جاہل انسان خدا سے اسی طرح سیکھتا ہے جس طرح بچہ بڑوں سے"[۲]

اس جملہ میں "جس طرح بچہ بڑوں سے" کی تشبیہ نہایت بلیغ ہے۔ قائل کی مراد یہ ہے کہ جس طرح بچہ بڑوں سے کوئی بات سیکھتا ہے اور بڑوں کی عظمت و جلالت اور اُن پر کامل اعتماد کی اذعانی کیفیت کے قلب پر مستولی ہونے کی وجہ سے بچہ کے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خطرہ نہیں گذرتا کہ بڑوں کا سکھایا ہوا سبق غلط ہو گا

---

[۱] جانسٹ کی تاریخ مسائل فلسفہ ص ۱۱۴ [۲] لیوس کی سوانحی تاریخ فلسفہ ص ۸۲

اسی طرح انسان جب کسی بات کو اس اذعان کے ساتھ قبول کرتا ہے کہ یہ منجانب اللہ ہے تو اُسے اسوقت کسی تردد و تذبذب سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ اور وہ اپنے قلب میں اطمینان و سکون کی ایک جاں فزا کیفیت محسوس کرتا ہے "

ڈیوڈ ہیوم کو سب جانتے ہیں کہ ارتیابی تھا اور وحی و الہام کا بھی منکر تھا لیکن پھر بھی ایک موقع پر ساز فطرت کے نغمہ کی ایک ہلکی سی آواز اُس کے زبانِ قلم سے ظاہر ہو ہی گئی۔ وہ لکھتا ہے :-

"جہاں تک تجربہ اس طرح کے مسائل کی تائید کرتا ہے۔ وہاں تک تو یہ استدلال پر مبنی ہوتے ہیں لیکن ان کی اصلی اور محکم بنیاد وحی و ایمان پر ہے[1]"

مولانا عبدالباری ندوی نے فہم انسانی کے دیباچہ میں اسی حقیقت کو نہایت دلچسپ اور بلیغ پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

ظواہر عالم کی نسبت ہم بہت کچھ جانتے اور جان سکتے ہیں۔ لیکن حقائق عالم کی نسبت کچھ جاننے کا دعوٰی کریں تو نرا جہل مرکب ہوگا اور بقول سقراط ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے۔ اس زندگی کو ہم چاہے جتنا سنواریں اور بنائیں لیکن اس کے آگے اور پیچھے کی اگر کچھ فکر ہو تو، "اول و آخر ایں کہنہ کتاب افتادست"، نہ پیچھے کا کچھ نشان ملا نہ آگے کی کچھ خبر دے سکتے ہیں سوائے اس کے کہ بس بیچ کے اوراق اُلٹ پلٹ کر لال بجھکڑوں کی طرح ہرن کے پاؤں میں چکی کا پاٹ باندھتے رہیے، غرض اپنے یا کائنات کے آغاز و انجام، حقیقت و ماہیت، غرض و غایت کے بارہ میں، یہ یا اس طرح کے جتنے سوالات یا ان کی تفصیلات ہوں، خالص عقل و استدلال نے ان کے بارہ میں کبھی اذعان و اطمینان نہیں بخشا، بلکہ فلسفہ سے انسانیت کی یہ پیاس اپنے حلق میں صرف کانٹوں کا اضافہ کرتی رہی اور جہاں انسانی عقل و فہم نے تجربہ کی راہ سے ذرا بھٹک کر

---

[1] فہم انسانی ص ۳۲

اس خار زار میں اپنے دامن کو الجھایا تو خود فلسفہ کی ساری تاریخ گواہ ہے کہ طفلانہ ہمت نے دو ہی چار قدم ڈالے تھے کہ شک اور ریب، جہل اور لاعلمی کے کانٹوں نے ہر طرف سے دامن پکڑنا شروع کیا، ایک نکلا نہیں کہ دوسرے نے پکڑا، جال کے اندر جتنا پھڑکو، وہ اتنا ہی کھال کے اندر گھستا جاتا ہے۔

انسانیت کی بیشتر آبادی ہمیشہ اس وادی میں وحی و ایمان کی رہنمائی کو قبول کرکے چلتی رہی، عقل کو اگر دخل دیا بھی تو زیادہ تر قبول ہی کے لئے۔ البتہ مغرب جہاں سے آفتاب نکلتا نہیں بلکہ جہاں ڈوبتا ہے وہاں کی نئی پرانی دنیا دونوں کو وحی و ایمان سے کچھ قدرتاً بُعد رہا ہو تو اس کے فلسفہ کی نئی پرانی دونوں تاریخوں کی جو کم و بیش ڈھائی ہزار سال کی وسعت میں پھیلی ہیں۔ ورق گردانی کر جاؤ، جتنا آگے بڑھتے جاؤ گے اتنا ہی دانش کی جگہ نادانی اور علم کی جگہ لاعلمی سے دوچار ہوتے جاؤ گے۔" (دیباچہ فہم انسانی)

اس حقیقت کو ایک اور مثال سے سمجھئے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے تمام مشاہدات کا تعلق بینائی سے ہے لیکن کیا یہ صحیح ہے کہ مشاہدہ کا انحصار صرف قوت بصارت کے صحیح وسالم ہونے پر ہے؟ ہرگز نہیں! بصارت کے ساتھ ساتھ خارجی روشنی کی بھی ایسی ہی ضرورت ہے جیسی کہ بینائی کی۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی تیز نظر ہو لیکن اگر کوئی خارجی روشنی نہ ہو، آفتاب کی ہو، یا کسی لیمپ یا بجلی کی اور تمام فضا تاریک ہو، تو ظاہر ہے کہ یہ تیز نظری کسی کام کی ثابت نہیں ہوگی۔ پس اسی طرح عقل میں قدرت کی طرف سے جو قوتِ بصیرت ودیعت رکھی گئی ہے وہ اپنی جگہ مسلم اور درست۔ لیکن جس طرح بصارت بغیر خارجی روشنی کے محض بےکار ہے۔ اسی طرح عقل کی روشنی صرف اسی وقت کارآمد ہوسکتی ہے جبکہ خارج میں بھی اس کی رہنمائی کے لئے کوئی قوی روشنی موجود ہو۔ اور یہ روشنی وہی ہے جس کو مذہب کی اصطلاح میں "وحی" کہتے ہیں۔ آیت ذیل میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِکَتُہٗ — وہ (خدا) وہی ہے جو خود اور اس کے فرشتے تم پر
لِیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ط — رحمت بھیجتے ہیں تاکہ وہ تم کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی
وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا ہ (الاحزاب) — طرف لے آئے اور اللہ مومنوں پر بڑا رحم کرنیوالا ہے

بصارت اور بصیرت میں صرف ظاہر و باطن کا فرق ہے، ورنہ دونوں کا حال افادہ کے اعتبار سے بالکل یکساں ہے۔ جس طرح آفتاب سماوی کے بغیر بصارت ناکارہ ہے ٹھیک اسی طرح عقل و خرد کی بصیرت خورشید حقیقت کی جلوہ پاشیوں کے بغیر اپنی ذاتی صلاحیتوں کے باوجود قطعاً بے فائدہ ہے۔ اور اگر کوئی شخص اس روشنی کے بغیر ہی محض عقل کے سہارے چلنا چاہتا ہے تو وہ اس بیوقوف سے کسی طرح کم درجہ کا احمق نہیں ہے جو نہایت شدید تاریکی میں بھی اپنی آنکھوں پر اعتماد کرکے سرپٹ دوڑنا چاہتا ہے۔

ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کیا خوب کہا ہے۔

انجامِ خرد ہے بے حضوری — ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہائے بے صوت — ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت
دل در سخنِ محمدی بند — اے پورِ علی ز بوعلیؒ چند

لہ مشہور مسلمان فلسفی شیخ ابو علی بن سینا۔

وحی کے لغوی و اصطلاحی معنیٰ

وحی کے معنی لغت میں حسب ذیل ہیں

اَلْوَحْیُ الاِشَارَۃُ وَالْکِتَابَۃُ وَالرِّسَالَۃُ   وحی کے معنی اشارہ کرنا، لکھنا، پیغام دینا، دل میں ڈالنا،

وَالْکَلَامُ الْخَفِیُّ وَکُلُّ مَا اَلْقَیْتَہٗ اِلٰی غَیْرِکَ   چھپا کر بولنا اور جو کچھ تم کسی دوسرے کے خیال میں ڈالو

اشارہ کرنا۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

تَرٰی عَیْنُہَا عَیْنِیْ فَتَعْرِفُ وَحْیَہَا   وَتَعْرِفُ عَیْنِیْ مَا بِہِ الْوَحْیُ تَرْجِعُ

قرآن مجید میں ہے۔

فَاَوْحٰۤی اِلَیْہِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُکْرَۃً وَّعَشِیًّا   تو اشارہ سے کہا ان کو کہ یاد کرو صبح اور شام

لکھنا۔ عجاج کا شعر ہے۔

حَتّٰی نَحَاہُمْ جَدُّنَا وَالنَّاحِیْ   لِقَدَرٍ کَانَ وَحَاہُ الْوَاحِیْ

"خط اور کتاب" لبید کا شعر ہے جو سبعہ معلقہ کے چوتھے معلقہ میں ہے۔

فَمَدَافِعُ الرَّیَّانِ عُرِّیَ رَسْمُہَا   خَلَقًا کَمَا ضَمِنَ الْوُحِیَّ سِلَامُہَا

"حکم دینا" عجاج کہتا ہے

وَحٰی لَہَا الْقَرَارَ فَاسْتَقَرَّتِ   وَشَدَّہَا بِالرَّاسِیَاتِ الثُّبَّتِ

"چھپا کر بات کرنا" ابو ذویب کہتا ہے۔

فَقَالَ لَہَا وَقَدْ اَوْحَتْ اِلَیْہِ   اَلَا لِلّٰہِ اُمُّکِ مَا تَعِیْفُ

آواز " ابو زبید کا مصرعہ ہے۔

مرتجز الجرف بوحی اعجم

لیکن اہل لغت کہتے ہیں کہ اس لفظ کے اصلی معنی دوسروں سے چھپا کر کسی سے چپکے چپکے بات کرنے کے ہیں کسائی عرب کا محاورہ بتاتا ہے " وحیتُ الیہ بالکلام واوحیہ الیہ ھُوَ ان تکلم بکلامٍ تخفیہ من غیرہٖ " یعنی کسی سے اس طرح باتیں کرو کہ اس کو دوسروں سے چھپاؤ " ابو اسحاق لغوی کہتا ہے " واصل الوحی فی اللغۃ کلّھا اعلامٌ فی خفاءٍ " وحی کا اصل مفہوم تمام لغت میں چھپا کر اطلاع دینا ہے۔

قرآن مجید میں بھی یہ لفظ متعدد معنوں میں آیا ہے۔

شیطان کا وسوسہ پیدا کرنا

یوحی بعضھم الی بعض وان الشیاطین	ان کے بعض بعض کو وحی کرتے ہیں اور بے شبہ شیطان
لیوحون الی اولیاءھم	اپنے دوستوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرتے ہیں

دل میں کسی بات کا ڈال دینا۔

واوحینا الی امّ موسیٰ ان ارضعیہ	اور ہم نے موسیٰ کی ماں کے دل میں یہ بات ڈالی کہ تم اُن کو دودھ پلاؤ۔

اس آیت میں بھی وحی دل میں بات ڈالنے کے معنی میں ہے۔

واذ اوحیتُ الی الحواریین ان اٰمنوا	اور جبکہ میں نے (حضرت عیسیٰ کے) حواریوں کے دل میں
بی وبرسولی	یہ بات ڈالی کہ تم مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لے آؤ

فطری حکم جس کو وحی نوعی بھی کہتے ہیں۔

واوحیٰ ربک الی النحل ان اتخذی	اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی کو وحی کی کہ تو
من الجبال بیوتًا	پہاڑوں میں گھر بنالے۔

کام پر مقرر کرنا۔

وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَاءٍ اَمْرَهَا — اور خدا نے ہر آسمان کو اُس کے کام پر مقرر کر دیا۔

پھر یہ فطری حکم ذی روح کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ بے جان چیزوں کے لئے بھی وحی کا لفظ فرمایا گیا ہے مثلاً اس آیت میں۔

یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰی لَهَا۔ — اُس دن زمین اپنا سب احوال بتائیگی کیونکہ آپکے رب نے اُس کو ان باتوں کی ہدایت دیدی ہے

چپکے بات کرنا۔

یُوحِی بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ — یہ ایکدوسرے کو چکنی چپڑی باتیں وحی کرتے ہیں

وحی کے یہ معانی لغت کے اعتبار سے تھے۔ لیکن شریعت اسلام کی اصطلاح میں وحی خاص اس ذریعہ غیبی کا نام ہے جس کے ذریعہ غور و فکر، کسب و نظر، اور تجربہ و استدلال کے بغیر خاص اللہ تعالیٰ کیطرف سے، اُس کے فضل و لطفِ خاص سے کسی نبی کو کوئی علم حاصل ہوتا ہے۔ وحی کا استعمال اس معنیٰ خاص میں اس کثرت سے ہوا ہے کہ وہ اس معنیٰ میں منقولِ شرعی بن گیا ہے اور اس لئے جب کسی نبی کے ذکر میں وحی کا لفظ بولا جائے گا تو اُس سے لامحالہ یہی معنی مراد ہوں گے۔ چنانچہ قرآن مجید کی آیات اس کی شاہد ہیں، اور جس کا ثبوت آئندہ باب سے مل جائے گا۔

اس کی مثال لفظ صلوٰۃ و زکوٰۃ اور حج کی سی ہے کہ اگرچہ ان کے لغوی معنیٰ اُن معانی مصطلحہ سے مختلف ہیں جن کے لئے اسلامی شریعت میں یہ مخصوص ہو چکے ہیں لیکن اصطلاحی معانی میں اُن کا استعمال اس کثرت سے ہوتا ہے کہ اب ان کے علاوہ کسی معنی میں یہاں تک کہ لغوی معنیٰ میں بھی ان کا استعمال صحیح نہیں ہے البتہ ہاں اگر سیاق یا سباق میں کوئی قرینہ ہو تو اُس وقت کوئی دوسرے معنی مراد لئے جا سکتے ہیں پس اسی طرح جب وحی کا لفظ مطلقاً بولا جائے گا تو اُس سے مراد یہی اصطلاحی معنیٰ خاص مراد ہونگے۔ لیکن قرینہ کے

موجود ہونے کی صورت میں دوسرے معنیٰ بھی مراد لئے جاسکتے ہیں جیسا کہ مذکورۂ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے

وحی اور الہام کا فرق | اس موقع پر وحی اور الہام کا فرق بھی معلوم کرلینا چاہیئے۔ وحی کے معنیٰ اوپر معلوم ہوچکے الہام کے لغوی معنیٰ ہیں القار الشئ فی القلب دل میں کسی چیز کا ڈالنا۔ قرآن مجید میں ہے۔

فالھمھا فجورھا وتقوٰھا — اللہ نے نفس انسانی کو بری باتوں اور نیک باتوں دونوں کا الہام کردیا ہے۔

وحی اور الہام میں یہ امر تو مشترک ہے کہ دونوں کسی چیز کے معلوم کرلینے کا ذریعۂ غیبی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ الہام ایک ایسا وجدان ہے جو نفس کو حاصل ہوتا ہے اور جس کے ذریعہ شئ مطلوب کا علم حاصل ہوجاتا ہے لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ علم کا مبدا کیا ہے، گویا یہ وجدان بھوک، پیاس، غم اور خوشی کے وجدان کی طرح ہے بخلاف وحی کے کہ اس میں علم کا مبدا پورے طور پر معلوم ہوتا ہے پھر ان میں ایک مابہ الفرق یہ بھی ہے کہ الہام نبی اور غیر نبی دونوں کو ہوتا ہے لیکن وحی انبیار کے ساتھ مخصوص ہے۔ کسی غیر نبی کو علم کا یہ ذریعۂ غیبی میسر نہیں ہوسکتا۔

وحی کی حقیقت | وحی کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اس کا صحیح علم تو بجز خدا کے اور کسے ہوسکتا ہے۔ البتہ فلاسفہ نے اپنی بساط کے مطابق کچھ پتہ چلانے کی فکر کی ہے۔ لیکن اس کا حاصل اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وحی کے امکان و جواز میں جو بہ ظاہر عقلی استبعاد نظر آتا ہے اسے دور کریں۔ اور یہ ثابت کردیں کہ علم و اطلاع کے جس ذریعۂ غیبی کو وحی کہتے ہیں اس کا تحقق انسان کے باطنی قویٰ اور ملکات کی دریافت و تحقیق کی روشنی میں ناممکن نہیں ہے۔ فلاسفۂ یونان کے تتبع میں متکلمینِ اسلام نے بھی اسی روش کو اختیار کیا ہے۔ اور انھوں نے بھی فلسفہ کی تحقیق اور اس کی اصطلاحات کی روشنی میں وحی کی حقیقت کا کھوج لگانے کی سعی کی ہے تاکہ وہ ان اعتراضات و اشکالات کا جواب دے سکیں جو وحی ایسی مابعد الطبیعی چیزوں پر فلسفہ کی طرف سے کئے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان ائمہ اسلام کی نیت نہایت مبارک اور پاک تھی، اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے

اُن کو اجر جزیل بھی عطا ہوگا۔ لیکن اس راہ سے اصل حقیقت کا سراغ پانے میں کس حد تک کامیاب ہوسکے ہیں؟ اس کا جواب نہایت مشکل ہے۔ ہم ذیل میں محض اسی رفع استبعاد کے نقطۂ نظر سے، اور نیز یہ دکھانے کے لئے کہ وحی کی حقیقت کی تشریح و بیان کے سلسلہ میں فلسفہ کہاں تک پرواز کرسکا ہے۔

امام غزالی اور دوسرے متکلمین کی آراء اس باب میں امام غزالی اور بعض فلاسفہ اسلام کا بیان نقل کرتے ہیں۔ مقاصد المراصد میں ہے۔

واما الوحی والالہام فالنفسُ الناطقۃُ	باقی وحی اور الہام تو اُن کی حقیقت یہ ہے کہ
اذا کانت قویۃ بحیث لم یکن	نفس ناطقہ جب اس قدر قوی ہوتا ہے کہ بدن
اشتغالہا بالبدن مانعًا من الاتصال	کے ساتھ مشغول ہونے کے باوجود مبادی قدسیہ
بالمبادی القدسیۃ وکانت المتخیلۃ	سے متصل ہوسکتا ہے اور اس کے ساتھ قوتِ متخیلہ
قویۃ بحیث تقوی علی استخلاص	اس قدر قوی ہوتی ہے کہ حس مشترک کو حواس
الحس المشترک عن الحواس الظاہرۃ	ظاہری سے نجات دے سکتی ہے تو نفس ناطقہ
اتصلت حالۃ الیقظۃ بالعقول	بیداری کی حالت میں بھی عقول مجردہ اور نفوس
المجردۃ والنفوس السماویۃ وحصل	سماویہ سے متصل ہوجاتا ہے اور اُس کو غیب
لہا ادراک المغیبات علی وجہٍ کلّی	کی باتوں کا ادراک کلی طور پر ہوتا ہے پھر قوت متخیلہ
ثم المتخیلۃ تحاکیہا بصورۃ جزئیۃ	اس کے مشابہ ایک جزئی صورت پیدا کرلیتی ہے
مناسبۃ لہا وتنزل الی الحس المشترک	یہ صورت حس مشترک میں اُتر کر مشاہد اور محسوس
فتصیر مشاہدۃ محسوسۃ وقد یعرض	ہوجاتی ہے اور بعضوں کو یہ پیش آتا ہے کہ وہ
لبعضہم ان یسمع کلامًا منظومًا او یشاہد	مسلسل کلام سنتے ہیں یا کوئی اچھی صورت دیکھتے
منظرًا بہیًّا یخاطبہ بکلامٍ منظومٍ فیما	ہیں جو اُن سے مسلسل الفاظ کے ذریعہ سے باتیں کرتی ہے

يَتَعَلَّقُ بِاَحوالِہٖ وَاحوالِ مَا يَقرُبُ مِنہُ — یہ باتیں خود انہی کے متعلق ہوتی ہیں یا اُنکے تعلقات سے متعلق۔

اس کے علاوہ معارج القدس میں نبوت کے زیرعنوان امام غزالی نے جو بسیط مضمون لکھا ہے اُس میں ایک فصل نبوت کے خواص میں ہے اُس میں تحریر فرماتے ہیں:۔

وَلَہَا خَوَاصُّ ثَلٰثٌ اَحَدُہَا تَابِعَۃٌ لِقُوَّۃِ التَّخَیُّلِ وَالعَقلِ العَمَلِی — نبوت کے تین خاصے ہیں، ایک خاصہ قوت تخیل اور عقل عملی کا تابع ہے۔

اس کے بعد اس خاصہ کو بہت شرح و بسط سے بیان کیا ہے جس کا حاصل وہی ہے جو مقاصد المراصد کی مندرجہ بالا عبارت سے مستفاد ہوتا ہے۔

ابن سینا کی رائے | اس مضمون کو شیخ بو علی سینا کے حوالہ سے ابوالبقا نے مختصر اور جامع و مانع الفاظ میں اسی طرح ادا کیا ہے۔ چنانچہ تعریفات میں جہاں وحی کی تعریف لکھی ہے لکھا ہے۔

نَحنُ نَرَی الاَشیَاءَ بِوَاسِطَۃِ الحِسِّ وَالنَّبِیُّ یَرَی الاَشیَاءَ بِوَاسِطَۃِ القُوَی البَاطِنَۃِ وَنَحنُ نَریٰ ثُمَّ نَعلَمُ وَالنَّبِیُّ یَعلَمُ ثُمَّ یَریٰ — ہم حس کے واسطے سے اشیاء کو دیکھتے ہیں اور نبی اشیاء کو قویٰ باطنہ کے ذریعہ دیکھتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں پھر جانتے ہیں اور نبی جانتا ہے پھر دیکھتا ہے۔

اس کے علاوہ شیخ ابوعلی بن سینا نے اپنی متعدد کتابوں میں وحی، الہام اور معجزات و خوارق عادات پر کلام کیا ہے۔ اشارات کا ایک مستقل عنوان اسی بحث کے لئے وقف ہے۔ رسالہ الفعل والانفعال میں لکھا ہے

"وحی اور کرامات تاثیر النفسانی فی النفسانی میں داخل ہیں، کیونکہ وحی کی حقیقت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کسی امر عقلی کا القاء خفی اُن نفوس بشریہ میں ہے جو اس القاء کو قبول کرنے کی استعداد رکھتے ہوں۔ اگر یہ القاء جاگنے کی حالت میں ہو تو اُسے وحی کہتے ہیں۔ اور

اگر نیند کی حالت میں ہو تو اس کا نام نفث فی الروع ہے"

(مطبوعہ مجلس دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن ۳۰)

اس کے بعد نفث فی الروع کی چند مثالیں احادیث سے نقل کی ہیں۔

ابن سینا کی یہ وحی کی تعریف نہایت مجمل اور مغالطہ انگیز ہے۔ اپنا ایک اور رسالہ الرسالۃ العرشیہ میں خدا کی صفات پر بحث کے ضمن میں صفت کلام پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"خدا کی ساتویں صفت متکلم ہونا ہے۔ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ وہ ذات واحد ہے اور علل اربعہ سے منزہ ہے۔ اس بنا پر اس کے متکلم ہونے کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ اس کے لئے عبارتیں پائی جاتی ہیں، یا اس کے لئے نفس کے خطرات اور فکر و تخیل کے ادراکات پائے جاتے ہیں جن پر الفاظ دلالت کرتے ہیں بلکہ خدا کے متکلم ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس کی طرف سے بواسطۂ قلم نقاش جس کو عقل فعال یا مقرب فرشتہ کہتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روح قلب پر علوم کا فیضان ہوتا ہے۔ پس کلام خدا اُن علوم کا نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور علم میں تعدد و تکثر نہیں ہوتا جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ — اور ہمارا کام تو بس ایک دم کی بات ہے جیسے پلک لگاہ کی۔

تعدد اور تکثر تو حدیث، نفس اور خیال و حس میں ہوتا ہے،

اصل میں صورت یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرشتہ کے ذریعہ علم غیب کو حاصل کرتے تھے۔ اور قوت تخیل اس کو قبول کر کے مختلف حروف و اشکال کی صورت سے مصور کر دیتی تھی، اس کے بعد نفس کی لوح جو اب تک خالی ہوتی تھی اُس میں یہ عبارتیں اور صورتیں منقش

ہو جاتی تھیں۔ اب ان سب کا اثر یہ ہوتا تھا کہ آپ منظوم و مرتب کلام سُنتے تھے اور ایک انسانی جسم کو دیکھتے تھے۔ پس اسی کا نام وحی ہے۔ الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نفس مُبارک ایک صاف وشفاف صیقل شدہ آئینہ کی طرح تھا جس میں القا کرنے والے اور وہ معانی و مطالب جن کا القا رجا تا تھا۔ دونوں مصور ہو جاتے تھے۔ کبھی ان معانی منقشۂ کا ظہور عبرانی زبان میں ہوا اور کبھی عربی میں، گویا یوں کہئے کہ مصدر ایک ہے اور مظاہر متعدد ہیں۔
اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نفس یا ذہن کے ذریعہ کسی طرح ملائکہ کی رویت کر لیتے تھے، کیونکہ حس کا حال یہ ہے کہ وہ کبھی محسوسات کو حواس ظاہری کے واسطہ سے قبول کرتی ہے اور کبھی مشاعر باطنہ کے واسطہ سے۔ ہم میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں فرق یہ ہے کہ ہم پہلے دیکھتے ہیں پھر جانتے ہیں اور آنحضرت پہلے جانتے تھے پھر دیکھتے تھے۔

(مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ص ۱۲)

حافظ ابن تیمیہ کی رائے لیکن اس معاملہ میں حافظ ابن تیمیہؒ نے مجموعۃ الفتاویٰ اور بعض اور تصنیفات میں زیادہ صاف بیانی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے ابن سینا اور اُس کے ہم خیال فلاسفہ کی تغلیط کی ہے اور ساتھ ہی امام غزالی پر نکتہ چینی کی ہے کہ وہ بھی فلسفہ سے مرعوب ہو کر وحی اور نبوت کے باب میں بعض ایسی باتیں بیان کر گئے ہیں جو قرآن و حدیث کی تصریحات کے خلاف ہیں اس سلسلہ میں امام ابن تیمیہ عقل فعال کے وجود سے انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر عقل فعال کا وجود صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نبوت وہبی نہیں کسبی ہے۔

بہرحال قرآن مجید سے وحی کے متعلق جو معلوم ہوتا ہے وہ صرف اسی قدر ہے کہ فرشتہ (جو فلاسفہ کے قول کے مطابق نفس انسانی کی صفات کا نام نہیں بلکہ وہ جواہر مجردہ اور قائم بالذات ہیں) خدا کا پیغام لیکر آنحضرت صلی اللہ پر نازل ہوتا تھا اور آپ کے قلب مطہر پر اس پیغام الٰہی کا القا کرتا تھا۔

وحی کی مختلف صورتیں

احادیث سے معلوم ہوتا ہے آپ پر وحی مختلف طریقوں سے نازل ہوتی تھی۔ حافظ ابن قیم نے زاد المعاد جلد اول میں انھیں حدیثوں کے پیش نظر وحی کی حسب ذیل صورتیں بیان کی ہیں۔

(۱) رویائے صادقہ	سچے خواب دیکھنا
(۲) نفث فی الروع یا القار فی القلب	دل میں پھونکنا یا دل میں ڈالنا
(۳) صلصلۃ الجرس	گھنٹی کی آواز کی طرح آنا
(۴) تمثل	فرشتہ کا کسی شکل میں متشکل ہو کر نظر آنا

(۵) فرشتہ کا اپنی اصلی صورت میں نظر آنا

(۶) وہ طریقہ مکالمہ جو معراج میں پیش آیا۔

(۷) بلا واسطہ مکالمہ

اب ہم ہر ایک کو تفصیل سے لکھتے ہیں۔

رویائے صادقہ رویائے صادقہ کے معنی ہیں سچا خواب، یعنی جو کچھ رات کو خواب میں دیکھا فوراً ہی یا کچھ دنوں کے بعد بعینہٖ اس کے مطابق کوئی واقعہ ظاہر ہو گیا۔ اس خواب کو نبوت کا چھیالیسواں جز بتایا گیا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو سعید الخدری سے روایت ہے الرؤیا الصالحۃ جزء من ستۃ و اربعین جزءاً من النبوۃ، لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ رویائے صادقہ کو نبوت کا جز محض اس لئے فرمایا گیا ہے کہ جس طرح نبی کی خبر بالکل صحیح ہوتی ہے اور اس میں کذب و دروغ کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا

اسی طرح یہ خواب بالکل سچا ہوتا ہے۔ جو رات کو خواب میں نظر آیا۔ دن کو وہی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

یہی وجہ ہے کہ رویاء صادقہ کو نبوت کا جزء قرار دیا گیا ہے رسالت کا نہیں کیونکہ نبوت کے معنی بعض غیبی امور سے واقف ہونا اور اُن کی اطلاع دینا ہے اور چونکہ رویاء صادقہ میں بھی یہی ہوتا ہے اس لئے اس کو نبوت کا ایک جزء کہا جا سکتا ہے۔ لیکن رسالت کا مقام اس سے بلند ہے اُس کے مفہوم میں احکام شرعیہ کی تبلیغ و اشاعت اور اوامر و نواہی سے لوگوں کو خبردار کرنا داخل ہے۔ ظاہر ہے رویاء صادقہ کا اس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

یہی رویائے صادقہ ہے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز ہوا۔ صحیح بخاری کے پہلے باب میں حضرت عائشہ سے روایت ہے

أَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهِ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ	سب سے پہلی وہ چیز جس سے آنحضرت صلی اللہ
عليه وسلم من الوحي الرؤيا الصالحةُ	علیہ وسلم پر وحی کا آغاز ہوا نیند میں رویاء صالحہ
في النوم فكان لا يرىٰ رؤيا إلا جاءت	ہے حضور جو خواب دیکھتے تھے وہ صبح کے تڑکے
مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ	کی طرح صحیح نکلتا تھا۔

[1] یہ واضح رہنا چاہئے کہ انبیاء کرام کا خواب ہمارے خواب اور اُن کی نیند ہماری نیند کی طرح نہیں ہوتی۔ اس عالم میں اُن کی آنکھیں اگرچہ بند ہوتی ہیں لیکن دل بیدار ہوتا ہے بخاری میں ہے

تَنَامُ اَعْيُنُهُمْ وَلَا تَنَامُ قُلُوبُهُمْ ان کی آنکھیں سوتی ہیں دل نہیں سوتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی نسبت فرماتے ہیں تنامُ عینی ولا ینامُ قلبی۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہئے کہ عربی زبان میں رویا صرف اس خواب کو کہتے ہیں جو کسی حقیقت کے اخبار و اعلام یا اُس کی جانب اشارہ و ایما پر مبنی ہو، عام خواب جس میں شیطانی وساوس کو زیادہ دخل ہو اُسے حلم جمع احلام کہتے ہیں چنانچہ بخاری کتاب الرویا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے (بقیہ حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ پر)

رویائے صادقہ سے آغاز وحی کی حکمت | حافظ ابن حجر خواب سے وحی کے آغاز کی حکمت یہ بیان کرتے ہیں کہ عالم بیداری میں حضور پُر نور پر جو وحی نازل ہونے والی تھی اس کے لئے بہ طور تمہید تو طیہ پہلی وحی خواب کے ذریعہ نازل کی گئی تاکہ آپ اس طرح خوارقِ عادات ایسی چیزوں کے لئے یک گونہ عادی ہو جائیں۔

نفث فی الروع | دوسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ آپ کے قلب پر بغیر نظر آئے کسی بات کا القاء کر دیتا تھا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ،، روح القدس نے میرے قلب میں یہ بات ڈالی ہے کہ کوئی نفس اُس وقت تک نہیں مریگا جب تک کہ وہ اپنے رزق کی تکمیل نہیں کرلے گا پس تم اللہ سے ڈرو اور طلب میں خوش روشی سے کام لو اور خبردار رہو کہ کہیں رزق کا متاخر ہو جانا تم کو اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ اللہ کی معصیت کی راہ سے اس رزق کو طلب کرو۔ کیونکہ اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اسکی طاعت و بندگی سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

الرویا من اللہِ والحلم من الشیطان — رویا اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور حلم شیطان کی طرف سے

پھران خوابوں میں جو خوابہائے پریشان ہوتے ہیں انھیں اضغاثِ احلام کہتے ہیں۔ سورۂ یوسف کی آیت ذیل میں تینوں لفظ جمع ہو گئے ہیں۔

یا ایھا الملاء افتونی فی رُئیای اِن کنتم — اے درباریو اگر تم خوابوں کی تعبیر بیان کر سکتے ہو تو
للرّؤیا تعبرون ۰ قالوا اضغاث احلام — میرے خواب کے بارہ میں اپنی رائے بیان کرو۔ ان
وما نحن بتاویل الاحلام بعلمین — لوگوں نے کہا۔ یہ تو اوہام پریشان ہیں اور ہم ان اوہام [illegible]

لیکن حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیریؒ کی تحقیق یہ ہے کہ رویا کے معنی خواب کے نہیں ہیں بلکہ وہ ایک ایسی حالت کا نام ہے جو نہ پورے طور پر بیداری ہے اور نہ کامل نیند بلکہ ان دونوں کی ایک درمیانی حالت ہے۔ حضرت الاستاذ فرماتے ہیں کہ میرا ذاتی خیال تھا لیکن مدت کے بعد علامہ فرید وجدی کی دائرۃ المعارف دیکھنے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ میں جو کچھ رویا کی حقیقت سمجھتا تھا وہی بعینہ محققینِ یورپ کا خیال ہے (فیض الباری مطبوعہ مصر ج ۱ صفحہ ۲۲)

صلصلۃ الجرس | تیسری صورت یہ تھی کہ وحی صلصلۃ الجرس یعنی گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی تھی صحیح بخاری میں ہے
"حارث بن ہشام نے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ پر وحی کس طرح نازل ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا، کبھی کبھی وحی میرے پاس گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی ہے اور یہ میرے اوپر سخت ترین ہوتی ہے۔ جب یہ مجھ سے منقطع ہوتی تھی تو فرشتہ جو کچھ کہتا تھا وہ سب مجھ کو یاد ہو جاتا تھا (باب بدء الوحی)
وحی کی اس خاص نوعیت کو سمجھنے کے لئے یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ صلصلۃ اصل میں اُس آواز کو کہتے ہیں جو لوہے کے ایک ٹکڑے کو دوسرے ٹکڑے پر مارنے سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن پھر اس میں توسیع کر لیا گیا ہے اور اس لفظ کا اطلاق ہر اُس آواز پر ہونے لگا ہے جس میں جھنجھناہٹ (طنین) ہو۔ وحی کی آواز کو اس آواز سے تشبیہ دی گئی ہے اور وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح گھنٹہ کی آواز صوت محض کی صورت میں سُنائی دیتی ہے اور اُس کا کوئی مبدا و مقطع نہیں ہوتا۔ اسی طرح وحی یا پیغامبر وحی کی اس آواز میں بھی کوئی مبدا یا مقطع نہیں ہوتا تھا۔ اس بنا پر یہ آواز مرکب نہیں بلکہ بسیط ہوتی تھی۔ شیخ اکبر محی الدین بن عربی نے وجہ شبہ یہ بیان کی ہے کہ جس طرح گھنٹہ کی آواز کے لئے کوئی جہت خاص نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ تمام جوانب و جہات سے سُنائی دیتی ہے اسی طرح وحی کی اس آواز کے لئے بھی کوئی جانب یا جہت نہیں ہوتی تھی۔ حضرت الاستاذ نے اس وجہ شبہ کو نہایت لطیف کہا ہے[1]، لیکن خود ایک جگہ فرماتے ہیں۔

وَصَلْصَلَۃُ الْجَرَسِ بِھِنَّا کَنَقَرَاتِ — اور نزول وحی کے وقت گھنٹہ کی سی آواز ٹیلیگرام کی
التِلغرافِ لِاَدَاءِ الرِّسَالَۃِ[2] — گھڑگھڑاہٹ کی طرح ہے جو پیغام رسانی کیلئے کی جاتی ہے

اس تشبیہ سے اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ تار کی گھڑگھڑاہٹ میں آواز تو سنائی دیتی ہے لیکن بولنے والا نظر نہیں آتا۔ اسی طرح وحی کی اِس صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محض آواز سنتے تھے لیکن بولنے والا نظر نہ آتا تھا۔

---

[1] فیض الباری مطبوعہ مصر ج ۱ ص ۱۹ — [2] مشکلات القرآن ص ۲۳۴

اس حالت کی شدت | جیسا کہ صلصلۃ الجرس والی حدیث میں مذکور ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ حالت بہت شاق گذرتی تھی۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔ آپ پر وحی نازل ہوتی تھی اور دن نہایت سرد ہوتا تھا۔ پھر بھی (وحی کے بارے) آپ پر دباؤ اس قدر شدید ہوتا تھا کہ آپ کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ نکلتا تھا، اور اگر آپ کسی سواری پر ہوتے تھے تو سواری بوجھ کے مارے زمین پر بیٹھ بیٹھ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی طرح وحی آئی حضرت زید بن ثابت اس وقت آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور سید کونین کا فرق مبارک ان کی ران پر تھا۔ حضرت زید پر وحی کا اتنا شدید بار ہوا کہ ان کا جسم دبا جاتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پارہ پارہ ہو جائے گا۔

حضرت عبادۃ بن صامت کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ کو اضطراب پیدا ہو جاتا اور چہرہ مبارک کا رنگ بدل جاتا۔ آپ اس وقت سر جھکا لیتے اور جو صحابہؓ آپ کے پاس بیٹھے ہوتے تھے وہ بھی سر نیچا کر لیتے تھے وحی کے بعد آپ سر اٹھاتے تھے[۱]۔

صفوان بن یعلی بن امیہ بیان کرتے ہیں کہ یعلی کو بڑی خواہش تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی ہوئی دیکھیں، خدا نے ان کی مراد پوری کی۔ ایک مرتبہ جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ میں قیام فرما تھے یعلی کو یہ سعادت نصیب ہو گئی اس کی تفصیل یہ ہے کہ جعرانہ کے دوران قیام میں آنحضرت صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص آیا جس نے خوشبو لگا رکھی تھی۔ اور سوال کیا " اے رسول اللہ! آپ اس شخص کی نسبت کیا فرماتے ہیں جس نے ایک خوشبو لگے ہوئے جبہ میں ہی احرام کی نیت کر لی "، یہ سوال سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑی دیر انتظار فرمایا، یہاں تک کہ آپ پر یکایک وحی نازل ہوئی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ حضور کا چہرہ مبارک سرخ ہے اور سانس بھی تیز ہو گیا ہے جیسے کوئی تھکا ہوا ہو، تھوڑی دیر کے بعد جب یہ کیفیت دور ہو گئی تو آپ نے سائل کو بلا کر

---

[۱] یہ واقعہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں کیف نزل الوحی کے ماتحت ہی بیان کیا ہے۔

اُس کے سوال کا جواب دیا۔[1]

ایک سوال اور اُس کا جواب اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وحی وحی تو سب برابر ہے پھر اس کی وجہ کیا ہے کہ آپ پر وحی کی یہ قسم (صلصلۃ الجرس) بقیہ طرقِ وحی کی بہ نسبت زیادہ گراں گذرتی تھی؟ اگر ایک نوعِ وحی کا تحمل بہ آسانی ہوسکتا تھا تو اس نوعِ وحی کا تحمل کیوں دشوار تھا؟ اس کا جواب، جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے یہ ہے کہ انسان میں دو قوتیں ہیں ایک قوتِ بشریت اور دوسری قوتِ ملکیت، پھر فرشتے جب اُن نفوسِ قدسیہ پر نازل ہوتے ہیں جن میں نبوت کی استعداد ہوتی ہے تو ان کو ظلمتِ بشری سے نکل کر عالم نور میں آنے کی وجہ سے سخت کش مکش اور مزاحمتِ باطنی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کش مکش کی وجہ سے ان کے تمام اعصاب متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال اس طرح سمجھئے کہ انسان نیند کی حالت میں کوئی ہیبت انگیز خواب دیکھتا ہے تو اگرچہ اس خواب کا تعلق جسم سے نہیں ہوتا لیکن نفس کے تعلق بالجسم کے باعث اس خواب کا اثر جسمانی اعضا و جوارح پر بھی ظاہر ہوتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے صلصلۃ الجرس کی تشریح بھی اسی تاثر و انفعال کی روشنی میں کی ہے فرماتے ہیں۔

واما الصلصلۃ فحقیقتہا اَنّ الحواس اذا	رہا صلصلۃ تو اُس کی حقیقت یہ ہے کہ حواس سے
صادَمہا تاثیرٌ قویٌّ تشوّشت فتشویشُ	جب کوئی قوی تاثیر متصادم ہوتی ہے تو وہ مشوش
قوّۃِ البصران یری الوانًا الحمرۃ والصفرۃ	ہو جاتے ہیں چنانچہ قوتِ بصر کی تشویش یہ ہے کہ
والخضرۃ ونحو ذالک وتشویشُ قوّۃِ	مختلف رنگ مثلاً سرخی، زردی اور سبزی نظر
السمع ان یَسمَعَ اصواتًا مبہمۃً کالطنین	آئیں وغیرہ ذالک، اور قوتِ سمع کی تشویش یہ
والصلصلۃِ والہمہمۃِ فاذا تمّ الاثرُ	ہے کہ مبہم آوازیں سنائی دیں مثلاً طنین، صلصلۃ

---

[1] صحیح بخاری باب نزل القرآن بلسانِ قریش

حَصَلَ العلمُ[۱] اور پھر جب اثر تام ہو جاتا ہے علم حاصل ہو جاتا ہے

حجۃ اللہ البالغہ میں ہی ایک دوسرے مقام پر باب الایمان بصفات اللہ تعالیٰ کے ماتحت اسی مضمون کو اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

وَرُبَّمَا یحصلُ عند توجہہ الی الغیب — اور بسا اوقات نبی کے غیب کی طرف متوجہ ہونے

وانقہار الحواس صوتُ صَلصلۃ الجرس — اور حواس کے مغلوب ہونے کی صورت میں گھنٹہ

کما قد یکون عند عروض الغشی من — کے بجنے کی سی آواز آتی ہے جیسا کہ غشی کے عالم

رؤیۃ الوان حُمرٍ وسودٍ — میں سرخ اور سیاہ رنگ نظر آتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کی مراد یہ ہے کہ یہ وہ خاص وقت ہوتا تھا جبکہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم عالم مادیت سے ورا الورا ہو کر ملاءِ اعلیٰ سے بہت زیادہ قریب ہو جاتے تھے اور اس وقت اگرچہ آپ کے حواسِ ظاہری میں تشویش پیدا ہو جاتی تھی لیکن ساتھ ہی آپ کی تمام روحانی قوتیں، باطنی احساس وشعور اور ملکوتی صفات وخصائص مکمل طور پر عالم لاہوت کے جلوہ زار میں پہنچ جاتے تھے اور وہاں آپ وہ سنتے تھے جسے دوسرے نہیں سن سکتے اور ان حقائق سے علیٰ وجہ الیقین آشنا ہوتے تھے جن کو نہ مادی حواس محسوس کر سکتے ہیں اور نہ جسمانی آلاتِ ادراک وشعور انھیں دریافت کر سکتے ہیں اور چونکہ اس وقت آپ کی جہتِ بشری اور جہتِ ملکوتی میں تصادم ہوتا تھا اس لئے اُس کا اثر آپ کے اعضاء واعصاب پر بھی پڑتا تھا اور اس اثر کے باعث آپ کو گھنٹہ کی سی آواز سنائی دیتی تھی، جبینِ اقدس عرق آلود ہو جاتی تھی۔ اور اس تاثر میں اس درجہ شدت ہوتی تھی کہ آپ کے پاس جو صاحب بیٹھے ہوتے تھے انھیں بھی اس حالت کا بیّن طور پر احساس ہوتا تھا جب یہ کش مکش ختم ہو جاتی تو آپ کی یہ حالت یعنی اعصاب کا تاثر بھی زائل ہو جاتا تھا اور تمام وحی من وعن آپ کو یاد ہو جاتی تھی چنانچہ حدیث کے الفاظ۔

[۱] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۲۰۶ جدید اڈیشن

فیفصِمُ عنّی وقد وعیتُ عنہُ — وحی مجھ سے جب منقطع ہو جاتی تھی تو مجھ کو اس وقت سب کچھ یاد ہو جاتا تھا۔

میں اس امر کا ہی اظہار فرمایا گیا ہے کہ لوگوں کو صلصلۃ الجرس کے لفظ سے یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ آپ محض آواز سنتے تھے اور وحی کا مضمون نہیں سمجھتے تھے۔ یا وحی کا مضمون اس وقت سمجھ لیتے تھے۔ لیکن وہ آپ کو محفوظ نہیں رہتا تھا۔ غور کیجئے بصیغہ ماضی وَعَیتُ فرمانا اس مضمون کو زیادہ مؤکد اور مُوثّق طریقہ پر بیان کرنے کے لئے ہی ہے۔

مزید تشریح صلصلۃ الجرس کی مخصوص نوعِ وحی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مقام پیش آتا تھا، اُس کا تعلق محض روح اور نفس سے ہے اس لئے اس کی تشریح اگر کوئی کرسکتا ہے تو صرف وہی شخص کرسکتا ہے جو اپنی باطنی اور روحانی قوتوں کے باعث عقل اور نفس کے ملکات اور عالم تجرد کے ساتھ ان دونوں کے تعلقات سے آگاہ ہو۔ حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی سے بڑھ کر ان اسرار و رموز کا محرم کون ہوگا! آپ حجۃ اللہ البالغہ کی جلد دوم بحث فی المقامات والاحوال میں فرماتے ہیں۔

اِنَّ القلبَ لہٗ وجہانِ وَجہ یمیلُ	قلب کے دو رُخ ہیں۔ ایک رُخ بدن اور اعضا کی
الی البدنِ والجوارحِ وَوَجہٌ یمیل	طرف مائل رہتا ہے اور دوسرا رُخ تجرد اور صرافت
الی التجرد والصرافۃ وکذالک العقل	کی طرف متوجہ رہتا ہے اسی طرح عقل کے بھی دو رُخ
لہ وجہانِ وجہٌ یمیل الی البدنِ	ہیں ایک رُخ بدن اور حواس کی طرف مائل ہوتا
والحواسِ وَوَجہٌ یمیل الی التجرد	ہے اور دوسرا رُخ تجرد اور بساطتِ محض کی جانب
والصرافۃِ فَسَمّوا مایلی الجانب الاسفل	پس جو رُخ جانب اسفل سے متصل ہے اُسی قلب
قلباً وعقلاً ومایلی الجانب الفوق	اور عقل کہتے ہیں اور جو جانبِ فوق سے ملا ہوا ہے
روحاً وسِرّاً فصفۃ القلب الشوق	اُسے روح اور سِر کہتے ہیں اور قلب کی صفت شوق

المزعجُ والوَجدُ وصفةُ الروح الأنسُ والانجذابُ وصفةُ العقل اليقين بما يقربُ مأخذهُ من مأخذ العلوم العادية كالايمان بالغيب والتوحيد الافعالي وصفة السِّر شهودُ ما يجلّ عن العلوم العادية وانّما هوَ حكايةٌ ما عن المجرّد الصرف الذي ليس في زمانٍ ولا مكانٍ ولا يوصفُ بوصفٍ ولا يُشارُ اليه باشارةٍ

بے پایاں اور وجد ہے، روح کی صفت انس و منجذب ہونا ہے اور عقل کی صفت ان چیزوں پر یقین کرنا ہے جن کا ماخذ علوم عادیہ (رسمیہ) سے قریب ہو جیسے ایمان بالغیب اور توحید افعالی۔ اب رہا سِر تو اس کا کام اُن حقائق کا مشاہدہ کرنا ہے جو علوم عادیہ سے بلند و بالا ہیں اس کے معنی بجز اس کے کچھ اور نہیں کہ یہ اُس مجرد محض کی حکایت ہوتی ہے جو نہ زمان میں ہے اور نہ مکان میں، اور جو نہ کسی وصف سے موصوف کیا جاسکتا ہے اور نہ جس کی طرف کوئی اشارہ ہوسکتا ہے۔

غور کیجئے! حضرت شاہ صاحب نے کس خوبی اور وضاحت سے بتایا ہے کہ روح کی صفت اُنس اور انجذاب ہے اور سِر کی صفت شہود و معائنہ ہے، دوسرے لفظوں میں یہ سمجھئے کہ روح کی صفت انفعالی ہے اور سِر کی صفت فعلی ہے۔ ان کیفیتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی سعادت مند روح پر جب آفتابِ حقیقت پرتو فگن ہوتا ہے تو اس کی شعاعیں شبنم کے قطروں کی طرح اس روح کو اپنے جلوہ گاہِ انوار میں جذب کر لیتی ہیں پھر عقل کا دوسرا رُخ جو جانبِ فوق سے متصل ہے۔ یعنی سِر، وہ اُبھرتا ہے اور اب وہ اس مجرد صرف سے حکایت کرنے لگتا ہے جو ولا عینٌ رأتْ ولا اُذنٌ سَمِعتْ کا مصداق ہے اور جو زمان و مکان کی حد بندیوں سے بلند و بالا ہے۔

اس موقع پر یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ قلب اور عقل یہ دونوں جس طرح انبیاء میں ہوتے ہیں اور انسانوں میں بھی ہوتے ہیں۔ لیکن فرق یہ ہوتا ہے کہ انبیاء کرام میں قلب اور عقل کا وہ رُخ جو روح اور سِر

کہلاتا ہے اس درجہ بلند اور قوی ہوتا ہے کہ کسی اور انسان میں یہ بات نہیں ہوتی، اس بنا پر ان کو عالمِ فوق سے اتصال ہوتا ہے اور انہیں ایسے ایسے مقامات اور احوال و مزایا پیش آتے ہیں جو دوسروں کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتے۔ قرآن مجید میں حضور پُرنور کی زبانِ حق ترجمان سے جو ارشاد فرمایا گیا ہے اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِثْلُکُمْ یُوْحیٰ اِلَیَّ، تو اس میں اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِثْلُکُمْ اعضا و جوارح میں انسانوں کے ساتھ مشارکت کی بنا پر ہے اور پھر یُوْحیٰ اِلَیَّ" جو فرمایا گیا ہے تو اس میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب و عقل کے دو فوقانی رُخ جو حضرت شاہ ولی اللہ کی زبان میں روح اور سِر ہیں وہ اس درجہ بلند اور ارفع ہیں کہ آنحضرت مہبطِ وحی ہیں۔

مگر بات یہ ہے کہ انسان، انسان ہونے کے باوجود جس طرح ایک بزدل انتہائی بہادر انسان کے شجاعانہ کارناموں کو، ایک غبی بڑے درجہ کی ذکاوت و ذہانت رکھنے والے انسان کی دماغی بلند پروازیوں اور ذہنی کمالات کو نہیں سمجھ سکتا، اور جب اُن کا ذکر سنتا ہے تو حیرت و استعجاب سے انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح "مجرد صرف"، "ذات حق"، اور حقیقت مطلقہ سے قرب و اتصال کے باعث انبیاء کرام پر جن اسرارِ الٰہیہ و کونیہ کا فیضان ہوتا ہے، ہم لوگ جب اُن کا ذکر سنتے ہیں تو ہمیں حیرت ضرور ہوتی ہے اور بسا اوقات وہ امور ہمارے لئے ناقابلِ فہم ہوتے ہیں، لیکن ہمیں یہ بات کبھی فراموش نہ کرنی چاہئے کہ ہمارے لئے کسی چیز کا ناقابلِ فہم ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ اُس کے وجود کا انکار ہی کر دیا جائے۔ مولانا شبلی مرحوم نے صحیح بخاری کی حدیث وحی پر کلام کرتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے: "آپ نے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کیا دیکھا؟ ناموس اعظم (حضرت جبریل) نے کیا کہا؟ کیا کیا مشاہدات ہوتے؟ یہ وہ نازک باتیں ہیں جو الفاظ کا تحمل نہیں کر سکتیں"، ایک مادر زاد اندھے کو روشنی کی حقیقت لاکھ کھول کر سمجھایئے کوئی بات اُس کے ذہن نشین نہیں ہوتی تو کیا شخص اس بنا پر نابینا کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ روشنی کے وجود کا ہی سرے سے انکار کر دے۔

یہ آواز کس کی تھی | سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا وہ حضرت شاہ ولی اللہ کے بیان کی روشنی میں صلصلۃ الجرس

کی تشریح و توضیح کے سلسلہ میں تھا۔ حضرت شاہ صاحب نے نفس آواز سے بحث نہیں کی یعنی یہ نہیں بتایا کہ یہ آواز خدا کی تھی یا فرشتۂ وحی کی یا خود وحی کی آواز تھی۔ انھوں نے صرف اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ یہ آواز خواہ کسی کی ہو اس کو زبانِ نبوت گھنٹہ کی آواز سے کیوں تشبیہ دی ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مختصراً اس کا بھی ذکر کر دیا جائے کہ یہ آواز کس کی تھی؟ اس باب میں سب سے زیادہ نمایاں مسلک امام بخاری کا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ آواز خدا کی ہوتی تھی جو تمام فضا میں گونج جاتی تھی۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اور اسکو نہیں سن سکتا تھا چنانچہ صحیح بخاری کتاب التوحید میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی یہ روایت نقل کرتے ہیں۔

اذا تکلم اللہ بالوحی سمع اہل السموات	اللہ تعالیٰ جب کلام بالوحی کرتا ہو تو اہل سموات کچھ
شیأً فاذا فزع عن قلوبہم وسکن الصوت	سنتے ہیں پھر جب اُن کے قلوب سے خوف وہراس کم
عرفوا انہ الحق ونادوا ماذا قال	ہو جاتا ہے اور آواز ٹھہر جاتی ہو تو وہ پہچانتے ہیں
ربکم قالوا الحق	کہ یہی حق تھا اور وہ آپس میں ندا کرتے ہیں کہ تمہارے
	رب نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں کہ حق کہا!

اس سلسلہ میں امام بخاری نے ایک اور روایت بھی نقل کی ہے جو عبداللہ بن انیس سے مروی ہو فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا، "اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں کو جمع کرے گا اور اُن کو ایسی ندا دیگا کہ قریب و بعید سب اُسے یکساں سنیں گے، پھر آگے چل کر ایک باب کا ترجمہ ،، وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيمًا" باندھا اور اس کے ذیل میں چند احادیث نقل کیں جن سے اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ چونکہ آیتِ بالا میں کَلَّمَ فعل کی تاکید مصدر تکلیم کے ساتھ لائی گئی ہے اس لئے علم نحو کے قواعد کے مطابق یہاں کلام سے مراد حقیقت ہی مجاز نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے وادیِ سینا میں جو آواز سنی تھی وہ بیج مچ خدا کی ہی آواز تھی

امام بخاری نے فرقہ جہمیہ کی تردید میں کتاب التوحید میں اور بھی احادیث پیش کی ہیں اور ان سے خدا کے لئے صوت کا ثبوت بہم پہونچایا ہے اس بنا پر صلصلۃ الجرس والی حدیث میں جس آواز کا ذکر ہے وہ امام بخاری کے نزدیک خدا کی ہی آواز ہے۔

ارباب تصوف وعرفان میں شیخ اکبر کا جو مقام ہے اہل علم سے پوشیدہ نہیں، وہ بھی خدا کے لئے صوت مانتے ہیں۔ چنانچہ حدیثِ وحی پر کلام کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ اللہ کی آواز کے لئے کوئی جہت اور سمت متعین نہیں کی جاسکتی اور چونکہ گھنٹہ کی آواز کا حال بھی یہی ہے کہ وہ ہر طرف سے سنی جاتی ہے اس بنا پر ہی صوت بالوحی کو گھنٹہ کی آواز سے تشبیہ دی گئی ہے، لیکن علماء کی اکثریت جس میں صحیح بخاری کے شارحین بھی داخل ہیں اس بات کی قائل ہے کہ یہ آواز فرشتۂ وحی کے پروں کی۔ یا فرشتہ کی زبانی وحی کی ہوتی تھی۔ حافظ ابن حجر ان میں سے پہلی شق کے قائل ہیں۔ واللہ اعلم۔

تمثل یعنی فرشتہ کا کسی انسانی شکل میں آنا

وحی کا چوتھا طریقہ یہ تھا کہ فرشتۂ وحی کسی انسان کی شکل وصورت میں آتا تھا اور وہ آپ سے خطاب کرتا تھا یہاں تک آپ کو وہ پوری بات یاد ہو جاتی تھی جو وہ آپ سے کہتا تھا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک شخص آیا جس کے کپڑے بہت زیادہ سفید اور بال بہت سیاہ تھے اس پر کوئی علامت سفر بھی نہیں تھی اور ہم میں سے کوئی ایک شخص بھی اسے نہیں جانتا تھا۔ یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر اس طرح بیٹھ گیا کہ اپنے گھٹنے حضور کے گھٹنوں پر ٹیک لیئے اور اپنے دونوں ہاتھ آپ کی رانوں پر رکھ دیئے پھر اسلام، ایمان، احسان، قیامت اور علامات قیامت سے متعلق آپ سے چند سوالات کئے۔ آپ ان سوالات کے جوابات دیتے جاتے تھے اور سائل ہر جواب پر صَدَقْتَ (آپ نے سچ فرمایا) کہتا جاتا تھا، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں ہمیں بڑا تعجب ہوتا تھا کہ یہ شخص سوال کرتا ہے اور جواب ملنے پر تصدیق بھی کرتا جاتا ہے گویا کہ اسے ان سوالات کے جوابات کا علم پہلے سے ہی تھا۔ سوال

جواب کے ختم ہونے پر یہ شخص واپس چلا گیا تو آنحضرتؐ نے حضرت عمرؓ سے دریافت فرمایا، "تم جانتے ہو کہ یہ کون شخص تھا؟" انھوں نے جواب دیا، "اللہ اور اُس کا رسول اعلم ہیں،" آپ نے فرمایا، "یہ جبرئیل تھے جو تم کو دین سکھانے آئے تھے۔"

صحابہ میں حضرت دحیہؓ خوبصورتی اور حسن و جمال کے لحاظ سے ممتاز تھے۔ اس لئے فرشتۂ وحی کبھی کبھی ان کی شکل میں بھی آتا تھا۔ صحیح بخاری میں ایک حدیث ہے کہ ایک مرتبہ جبرئیل امین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور باتیں کرنے لگے۔ اس وقت آنحضرتؐ کے پاس ام سلمہؓ بیٹھی ہوئی تھیں آپ نے ان سے پوچھا، "یہ کون ہیں،" وہ بولیں، "یہ تو دحیہ ہیں،" ام سلمہ کا بیان ہے کہ بخدا میں ان کو دحیہ ہی سمجھتی رہی یہاں تک کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ سُنا جس میں آپ نے جبرئیل امین کے آنے کی خبر دی۔ تب میں سمجھی کہ جبرئیل دحیہ کی شکل میں آئے تھے۔[1]

اسی طرح کا ایک واقعہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے ساتھ پیش آیا، ایک مرتبہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ ایک شخص سے گفتگو کر رہے ہیں جو سواری پر سوار ہے۔ جب آپ گھر واپس گئے تو ام المؤمنین نے پوچھا، "یہ کون شخص تھا جس سے آپ گفتگو کر رہے تھے؟" ارشاد ہوا، "یہ جبرئیل تھے انھوں نے مجھ کو حکم کیا ہے کہ میں بنو قریظہ کی طرف چلا جاؤں۔[2]"

فرشتہ کا اپنی اصلی شکل میں آنا وحی کا پانچواں طریقہ یہ تھا کہ فرشتہ اپنی اصلی شکل میں آتا تھا اور اللہ کا پیغام آپ تک پہنچاتا تھا۔ حضرت عائشہ کا بیان ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل کو ان کی اصلی شکل میں دو مرتبہ دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ واقعہ معراج میں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اور ایک دفعہ کسی اور مقام پر غالبًا اجیاد میں۔ بعض علماء کی رائے ہے کہ قرآن مجید میں سورۂ النجم کی مندرجہ ذیل آیات انھیں

---

[1] باب کیف نزل الوحی

[2] یہ واقعہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں کیف نزل الوحی کے ماتحت نقل کیا ہے۔

دو واقعوں سے متعلق ہیں۔ معراج کے علاوہ آنحضرت نے جو جبرئیل امین کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا تھا اس کا ذکر ان آیات میں ہے۔

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى

انکو بڑی طاقتوں والے اور مضبوط نے تعلیم دی۔ پھر وہ سیدھا ہوگیا اور وہ بہت اوپر آسمان کے کنارہ پر تھا۔ پھر وہ قریب ہوا اور لٹک گیا۔ اب فاصلہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم تھا اور خدا نے اپنے بندہ پر وحی کی۔ جو کی۔ دل نے جو کچھ دیکھا اُسے جھوٹ نہیں کہا۔ کیا تم لوگ پیغمبروں سے اُن چیزوں پر جھگڑتے ہو جو انھوں نے دیکھی ہیں۔

ان آیات میں جبرئیل امین کی جو صفات بیان کی گئیں ہیں سورۂ تکویر میں بھی اُن میں سے بعض کا ذکر ہے ارشاد ہے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ

یہ کہا ہوا ہے ایک کریم قاصد کا جو طاقتور ہے۔ اور جو عرش کے مالک خدا کے نزدیک مرتبہ والا ہے اسکی اطاعت کی جاتی ہے اور وہ وہاں امانت دار ہے اور تمہارے ساتھی (آنحضرت) مجنون نہیں ہیں۔ انھوں نے فرشتہ کو افق مبین پر دیکھا ہے۔

سورۂ النجم اور سورۂ تکویر کی ان آیتوں پر غور کیجئے۔ ان میں یہ بات مشترک ہے کہ جبرئیل امین کی صفت ذی قوۃ اور امین بیان کی گئی ہے اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ آنحضرت نے ان کو افق اعلیٰ پر دیکھا ہے۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ اس مرتبہ فرشتہ وحی کا نزول کسی غیر معمولی اور عظیم و

جلیل شکل میں ہوا اور دوسری یہ کہ فرشتہ نے خود اپنی زبان سے وحی کا تلفظ کیا تھا، "انّہٗ لقول رسولٍ کریم" سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے، پھر دونوں صورتوں میں فرشتہ کے ورود و نزول کے بیان کے بعد اسکی بھی تصریح کردی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا اور سُنا وہ سرتاسر حق تھا اور آپ کا دل ایک ایک بات کی تصدیق کر رہا تھا اسے کوئی اشتباہ نہیں تھا۔

دوسرا واقعہ حضرت جبریل کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنے کا جو معراج میں پیش آیا اُس کا ذکر اس آیت میں ہے۔

وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَھٰی عِنْدَھَا جَنَّۃُ الْمَاْوٰی اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی

اور آنحضرت نے دوسری مرتبہ بھی اُترتے ہوئے جبریل کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا ہے جسکے پاس جنۃ الماویٰ ہے۔ اس وقت سدرہ پر عجیب و غریب انوار چھائے ہوئے تھے (مگر) نہ نگاہ بھکی اور نہ اُس نے سرکشی کی۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، علماء کے ایک گروہ کا خیال یہی ہے کہ سورۃ النجم کی آیاتِ بالا دونوں واقعوں سے متعلق ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ حضرت عائشہ کی ایک روایت سے اس کی تصدیق و تائید بھی ہوتی ہے۔ لیکن اس مقام پر ایک شبہ یہ ہے کہ فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ میں اگر اوحیٰ کی ضمیر مرفوع مستتر کو جبریل کی طرف لوٹایا جائے تو اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ وحی کرنے والے جبریل امین ہیں حالانکہ اسی سورۃ کے شروع میں "علّمہٗ شدید القویٰ" فرماکر ان کی حیثیت موحی کی نہیں بلکہ معلم کی بتائی گئی ہے اور قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں بھی ایحاء کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف کی ہے مثلاً ایک مقام پر ہے "واِن اھتدیتُ فبما یوحی اِلیَّ ربّی" ایک جگہ ہے "ذالِکَ مِمّا اوحیٰ الیکَ ربُّکَ مِنَ الحکمۃِ" ایک سورۃ میں ہے "وَالّذی اوحینا الیکَ مِنَ الکتابِ ھُوَ الحقُّ مُصَدِّقاً لما بَیْنَ یدیہِ"

ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے "ذالک من انباء الغیب نوحیہا الیک" اگر کہیں یُوحیٰ بہ صیغۂ مجہول لایا بھی گیا ہے تو وہاں بھی "من ربی" فرماکر اس امر کی وضاحت کردی گئی ہے کہ ایحار اللہ تعالیٰ کا ہی فعل ہے جیسے اس آیت میں:- "قل اِنّمَا اَتّبِعُ مَا یوحیٰ اِلَیّ مِن رَبّی" ہاں! اس میں شک نہیں کہ بعض آیات میں ایحار کی نسبت خود جبرئیل امین کی طرف بھی کی گئی ہے لیکن ایسے واقع پر ان کی حیثیتِ رسول بھی متعین کردی گئی ہے اور ساتھ ہی خدا کا ذکر ہے جیسے اِس آیت "او یُرسِلَ رَسُولاً فیوحِیَ باذنہٖ مَا یشَاءُ" اس سے مقصد یہ ہے کہ جہاں التباس واشتباہ کا خدشہ نہ ہو جبرئیل کی طرف ایحار کی نسبت کردینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

یہ اور اس طرح کے بعض اور اشکالات کے باعث سورۂ النجم کی یہ آیات بھی مشکلات قرآن میں شمار کی گئی ہیں جن پر افسوس ہے کہ مفسرین اور علمارِ سیرت نے کچھ زیادہ توجہ نہیں کی اور جو کلام کیا ہے وہ محض سطحی اور سرسری ہے۔ اس موقع پر ہم ذیل میں مختصراً وہ تقریر نقل کرتے ہیں جو حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیریؒ نے "مشکلات القرآن" میں کی ہے اور جسے مولانا شبیر احمد العثمانی نے فتح الملہم کی جلد اول میں صفحہ ۳۳۵ - ۳۳۶ پر نقل کیا ہے۔ حضرت الاستاذ فرماتے ہیں:-

علامہ کشمیری کی تقریر | اس سورۃ میں نجم (ستارہ) کی قسم اس لئے کھائی گئی ہے کہ اس کے بعد جو کلام ہے وہ آسمان کی خبر اور معراج وغیرہ سے متعلق ہے۔ ان آیتوں کا خلاصہ اور لُبّ لباب یہی چیزیں ہیں اِن ھُوَ اِلاَّ وَحیٌ یُوحیٰ میں فعل بہ صیغۂ مجہول لایا گیا اور مُوحِی کی کوئی تعین نہیں کی گئی کیونکہ ایحار بجز اللہ تعالیٰ کے کسی اور کے لئے ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ وصف خدا میں منحصر ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جو اوصاف موصوف کی ذات میں منحصر ہوں اُن کا ذکر خود موصوف کے تسمیہ سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے مثلاً "مَرَرتُ باکرمِ القومِ" اس کے بعد فرمایا گیا "عَلَّمَہٗ شَدِیدُ القُویٰ" اس میں مُوحِی کے ذکر کے بعد مُعَلِّم کی طرف

انتقال ہے۔ کیونکہ یہاں دو گرامی شخصیتوں کا ذکر ہے، ایک اللہ تعالیٰ جو موحی ہو اور دوسرا معلم جو جبرئیل ہیں۔ اس کے بعد معلم کے اوصاف بتائے گئے کیونکہ کلام اہل مکہ کے ساتھ ہے اور یہ لوگ جبریل کی معرفت نہیں رکھتے تھے اس لئے جبریل کا فعل اور اُن کی صفات بیان کی گئی۔ اور یہی وہ اوصاف ہیں جو سورۂ تکویر میں بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ان آیات کا مقصد گویا یہ بتانا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کس طرح آتی تھی؛ اور اسکی صفت کیا تھی؛

حضرت الاستاذ نے اس کے بعد حافظ ابن قیم کی تفسیر کی روشنی میں ذو مِرّۃٍ فاستویٰ کے مطلب کی تشریح کی ہے جس کا یہاں ذکر کرنا غیر ضروری ہے۔ پھر فتدلّٰی کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ

جیسا کہ قاضی بیضاوی نے ذکر کیا ہے اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس حالت میں جبریل اپنے مکان سے متجاوز نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ تدلّٰی کے معنی ہیں استرسال مع التعلق جیسے پھل کے لٹک آنے کو تدلّٰی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جبریل امین کی تدلی کی مثال اس روشنی کی مانند ہے جو فضا میں پھیلی ہوئی ہو اور کسی روشندان میں سے ہو کر بھی گذر رہی ہو، اس کو دیکھنے والا اپنے گھر میں دیکھتا ہے مگر پھر بھی وہ جانتا ہے کہ روشنی اپنے موضع سے منفصل نہیں ہے تدلّٰی کے لفظ سے جب یہ معنی مراد لئے جائیں تو اس سے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ حضرت جبریل کس طرح بصورت بشر آتے تھے۔ اس کے بعد فرمایا گیا فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ،، اس میں ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے۔ جبریل کی طرف نہیں، امام طبری کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں ،، فاوحیٰ اللّٰہ الیٰ ما اوحیٰ،، یہی معنی امام مسلم کے نزدیک مراد ہیں۔ اور امام بخاری نے شریک بن ابی نمر سے جو روایت نقل کی ہے اس سے بھی یہی معنی مستفاد ہوتے ہیں امام احمد (مسند صفحہ ۱۴۹/۳) نے ثابت عن انس کے طریق

سے جو روایت کی ہے اس سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔ ان سب روایتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آیت "فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ" واقعۂ معراج (لیلۃ الاسراء) سے متعلق ہے۔ اس سلسلہ میں اُن روایات کی مراجعت کرنی چاہئے جو ابن کثیر (صفحہ ۲۲۵/۳) میں بہ طریق بن ابی الکلثمہ اور مسند احمد صفحہ ۴/۱ میں امام احمد سے منقول ہیں۔

پوچھا جا سکتا ہے کہ اس صورت میں جبکہ "اوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ" میں اوحیٰ کا فاعل جبریل کے بجائے خدا کو بنایا جائے۔ انتشارِ ضمائر اور انفکاک فی النظم لازم آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ شبہ بے بنیاد اور نادرست ہے کیونکہ ایحار کا وصف اللہ تعالیٰ میں منحصر ہے اور سورۂ النجم کی ان آیات میں دو کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک موحی اور دوسرا معلم اس بنا پر اوحیٰ کی ضمیر مرفوعِ مستتر خدا کی طرف ہی راجع ہونی چاہئے۔ انتشارِ ضمائر معنیٰ میں التباس و اشتباہ کا سبب ہوتا ہے۔ اس بنا پر وہ ناجائز ہے۔ لیکن یہاں معنیٰ میں اشتباہ کا امکان ہی نہیں۔

علاوہ ازیں ایک بات یہ بھی ہے کہ ان آیتوں میں عطف واو کے ذریعہ سے نہیں کیا گیا ہے بلکہ وہ ایک مرتب سلسلہ ہے جس میں بعض چیزیں بعض چیزوں پر خارج میں مرتب ہوتی چلی گئی ہیں۔ اور ان سب کی انتہا اللہ پر ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے "فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ" اس مضمون کے لئے بہ طور خلاصہ ہے جو "اِنْ ھوَ اِلّا وحیٌ یُوحیٰ" میں بیان کیا گیا ہے۔ اب پھر اسی مضمون کو بیان کیا جا رہا ہے جیسا کہ "اِھْدِنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمتَ علیھم" میں کیا گیا ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا "ما کذب الفؤادُ ما رائی" اس کو ماقبل سے منفصل لایا گیا اور عطف نہیں کیا گیا۔ کیونکہ یہ دل سے اللہ کی رویت اور جبریل امین کی اُن کی اصلی شکل میں

رویت کے مضمون پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں رویتیں معراج سے پہلے کی ہیں پھر مَا رَاٰی میں اللہ اور جبرئیل کی رویت کے علاوہ وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو آپ نے شب معراج میں دیکھیں۔ چنانچہ آگے چل کر فرمایا گیا ہے۔

لَقَدْ رَاٰی مِن اٰیاتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی — آنحضرت نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں

سورۂ بنی اسرائیل میں ذکر ہے۔

لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیاتنا — تاکہ ہم آپ کو اپنی آیات دکھائیں۔

پھر اسی مقام پر ہے۔

وَمَا جَعلنَا الرُّوْیَا الَّتِیْ اَرَیْنٰاکَ — اور جو رویا ہم نے آپکو دکھایا ہے ہم نے اس کو

اِلَّا فِتْنَۃً لِلنَّاسِ — لوگوں کے لئے آزمائش کی چیز بنایا ہے۔

اس آیت میں جو فتنہ ہے یہ وہی ماراۃ (جھگڑنا) ہے جس پر "افتمارُوْنہٗ علیٰ مایریٰ" فرماکر مارات کرنے والوں کو زجرو توبیخ کی گئی ہے۔

اس تقریر سے یہ بات واضح ہوگئی ہو گی کہ ماکَذَبَ الفوادُ مارَاٰی کی تقدیر عبارت یوں ہے ماکذب الفوادُ عَبْدَنا ما راٰی، اس راٰی کا فاعل عبد یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ رویت عام ہے خواہ دل کے ذریعہ سے ہو یا آنکھ کے ذریعہ۔ اس صورت میں کَذَبَ متعدی بدو مفعول ہوگا اور اسمیں کوئی دشواری نہیں کیونکہ تکذیب کی طرح کذب بھی متعدی بدو مفعول ہوکر آتا ہے مثلاً یوں کہیں صَدَقْتُ فلانًا الحدیثَ وکذبتُہٗ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کو ایک مفعول پر ہی مقتصر مانا جائے۔ جیسا کہ امام نووی نے فراء سے نقل کیا ہے۔ اس صورت میں یہ معنی ہونگے کہ دل نے اس معاملہ میں جھوٹ نہیں کہا بلکہ اس نے وہی کہا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں عیاناً دیکھا۔

آگے چلئے ارشاد ہوتا ہے "وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخریٰ" اس میں اگر راٰی کا فاعل آنحضرت

کو نہیں بلکہ فواد کو بنایا جائے تو یہ زیادہ واضح بات ہوگی اور اب اس صورت میں معنیٰ یہ ہوں گے کہ قلب نے جو کچھ دیکھا تھا اُس کو مِن وعَن بیان کر دیا اور اس میں جھوٹ نہیں کہا۔ یہاں رویت سے مراد رویتِ فواد ہوگی اور بعد میں جو رویت بصر کا ذکر ہے تو واضح رہنا چاہیئے کہ ان دونوں میں کوئی تصادم اور تعارض نہیں ہے کیونکہ رویت امر واحد ہے خواہ دل سے ہو یا آنکھ سے فرق صرف فاعل کا ہے اس لئے عبارت میں انفکاک اور نظم میں انتشار پیدا نہیں ہوتا۔

مرفوع احادیث اور صحیح آثار سے بھی پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی رویت دو مرتبہ ہوئی ہے ایک مرتبہ دل سے اور دوسری مرتبہ آنکھ سے ماکذب الفوادُ ما رایٰ کے بعد جو اَفتمارونہٗ علیٰ مَا یَریٰ " ہے اُس میں بجائے صیغہ ماضی کے یریٰ بصیغۂ مضارع فرمانا بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ رویتِ اولیٰ کے علاوہ کوئی اور رویت ہے۔ حضرت ابن عباس کا ایک اثر ہے اُس سے بھی اس کی ہی تائید ہوتی ہے آپ فرماتے ہیں" محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دو مرتبہ دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ آنکھ سے اور دوسری مرتبہ دل سے، علامہ طبرانی نے اس اثر کو اوسط میں نقل کیا ہے اور سوائے جہور بن منصور الکوفی کے اسکے تمام راوی صحیح کے رُواۃ ہیں، جہور بن منصور کو بھی ابن حبان نے ثقات میں شمار کیا ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں " ولقد راٰہُ نزلۃً اخریٰ " میں جو رویت ہے وہ خدا اور جبرئیل دونوں سے متعلق ہے۔ جبرئیل امین کی رویت تو ظاہر ہے۔ اللہ کی رویت ماننے کی صورت میں یہ کہنا پڑیگا کہ جس طرح بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ خدا رات کے ثلث آخر میں سماء دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے۔ اسی طرح اس آیت میں بھی نَزلۃً اُخریٰ کے معنی نزول الٰہی کے ہو سکتے ہیں۔ اب رہا " عند سِدرۃِ المنتھیٰ " تو یہ واضح رہنا چاہیئے کہ ظرف یعنی عِندَ سِدرۃِ المنتھیٰ مریٰ کے ساتھ متعلق نہیں بلکہ رویت کے ساتھ ہے جیسے کہتے ہیں " رأیتُ الھلال عند المسجد " اس تقریر کی بنا پر عند سدرۃ المنتھیٰ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کو متعین کرتا ہے نہ کہ جبریل یا خدا کے مقام کو۔

حضرت الاستاذ کی یہ تقریر نہایت مفصل ہے[1]۔ اور آپ نے اُس میں عجیب و غریب نکات و لطائف مستند حوالوں کی روشنی میں بیان کئے ہیں۔ ہم نے مذکورہ بالا انتخاب میں جستہ جستہ وہی فقرے نقل کئے ہیں جو ہمارے موضوعِ بحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس تقریر سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ سورۂ النجم کی آیاتِ مبحوث عنہا صرف واقعۂ معراج سے متعلق ہیں اور ان میں لیلۃ الاسراء کے ہی احوال و کیفیات کو نہایت بلیغ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ وحی اس واقعہ کی ابتدائی منزل ہے اس لئے شروع میں وحی کی صفت اور اُس کی کیفیت و امکان پر روشنی ڈالی گئی ہے

آیات النجم کی مذکورہ بالا تفسیر کے مطابق حضرت جبریل کی اُن کی اصلی شکل میں رویت ایک تو وہ ہے جو معراج میں ہوئی۔ اب رہی دوسری رویت جس کا ذکر حضرت عائشہ نے کیا ہے تو اُسکی نسبت مختلف روایتیں ہیں حضرت عائشہ کی ہی ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسری رویت کا واقعہ ایک مقام پر جس کا نام اجیاد ہے پیش آیا تھا بعض روایتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غارِ حرا میں آپ پر جب پہلی وحی "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ" نازل ہوئی تو اُس دفعہ جبریل اپنی اصلی شکل میں ہی تشریف لائے تھے۔ ہمارے نزدیک یہی صحیح ہے اور بخاری کی احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ہم ذیل میں پوری حدیث نقل کرتے ہیں تاکہ اس خاص مسئلہ کے علاوہ وحی کی بعض اور کیفیات پر بھی روشنی پڑ جائے۔

"حضرت عائشہ ام المومنین سے روایت ہو کہ سب سے پہلی وحی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی وہ خواب میں بصورت رویائے صالحہ تھی آنحضرت جو خواب دیکھتے تھے وہ صبح کے روشن اُجالے کی طرح سچ نکلتا تھا۔ پھر آپ کو تنہائی محبوب ہو گئی، غارِ حرا میں جا کر آپ تنہا کچھ دن بسر کرتے تھے اور گھر آنے سے پہلے کئی کئی شب عبادت میں مصروف رہتے تھے، کھانے پینے کی چیزیں بھی ساتھ لیجاتے تھے

[1] پوری تقریر کے لئے دیکھو مشکلات القرآن مطبوعۂ علمی ڈابھیل از صفحہ ۲۴۰ تا ۲۶۲

جب وہ سامان ختم ہو جاتا تو گھر واپس آ تے ۔ اور پھر نیا سامان لے کر غار میں تشریف لے جاتے ۔ یہاں تک کہ غار میں ہی حق آپ کے سامنے آیا اور وہ فرشتہ "آپ کے پاس پہونچا اور اُس نے کہا "پڑھ" آپ نے فرمایا "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" حضور فرماتے ہیں "اب اُس فرشتہ نے مجھ کو پکڑ کر اتنا دبایا کہ میں تھک گیا ۔ پھر اُس نے مجھ کو چھوڑ دیا اور کہا "پڑھ" میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" اب اُس فرشتہ نے مجھ کو پکڑ لیا اور پھر دبایا یہاں تک کہ میں تھک گیا ۔ پھر اُس نے مجھ کو چھوڑ دیا اور کہا "پڑھ" میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" فرشتہ نے تیسری مرتبہ پھر مجھ کو پکڑا ۔ دبایا اور چھوڑ دیا اور کہا ۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ	پڑھ اپنے پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا ہے
الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ	جس انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا ہے، پڑھ
الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ	اور تیرا پروردگار بڑا بزرگ ہے جس نے قلم کے ذریعہ سکھایا
مَا لَمْ یَعْلَمْ	اور انسان کو وہ کچھ سکھایا ہے جسے وہ نہیں جانتا تھا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان آیتوں کے ساتھ گھر واپس آئے ۔ قلب مبارک لرز رہا تھا حضرت خدیجہ بنت خویلد کے پاس آئے اور فرمایا "مجھ کو کمبل اُڑھا دو" "مجھ کو کمبل اُڑھا دو" لوگوں نے آپکو کمبل اوڑھا دیا یہاں تک کہ دہشت کی وہ حالت جاتی رہی ۔ پھر آپ نے حضرت خدیجہ سے سارا ماجرا بیان کیا اور فرمایا کہ مجھ کو اپنی جان کا خطرہ ہے ۔ حضرت خدیجہ بولیں ہرگز نہیں خدا آپ کو کبھی رسوا نہیں کریگا آپ قرابت داروں سے صلہ رحمی کا برتاؤ کرتے ہیں ۔ لوگوں کا بوجھ خود اُٹھاتے ہیں ۔ اپاہجوں اور محتاجوں کے لئے کمائی کرتے ہیں ۔ مہمانوں کی مہمان داری کرتے ہیں مصائب و حوادث میں آپ حق کی امداد و اعانت کرتے ہیں " پھر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لیکر ورقہ بن نوفل کے پاس آئیں جو حضرت خدیجہ کے چچا زاد بھائی تھے اور جنہوں نے عہد جاہلیت میں عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا ۔

یہ انجیل کو عبرانی میں لکھتے تھے جتنا بھی لکھ سکتے تھے۔ بڈھے بہت تھے۔ بصارت جاتی رہی تھی۔ حضرت خدیجہ نے اُن سے کہا "بھائی! ذرا اپنے بھتیجے کی تو سنو" ورقہ بولے "بھتیجے بتاؤ تم کیا دیکھتے ہو؟" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا کہہ سنایا۔ ورقہ بولے "یہ وہی ناموس (محرم اسرار) ہے جسکو اللہ نے موسیٰ پر نازل کیا تھا۔ اے کاش میں اس وقت جوان ہوتا۔ اے کاش میں اس وقت زندہ ہوتا جبکہ تمہاری قوم تم کو نکال دیگی" آنحضرت نے پوچھا "کیا میری قوم مجھ کو نکال دیگی؟" انھوں نے جواب دیا۔ "ہاں! جو چیز تم لے کر آئے ہو وہ ایسی چیز ہے کہ جو کوئی اُس کو لیکر آیا اُس کے ساتھ دشمنی کی گئی اور اگر میں اس روز تک زندہ رہا تو میں تمہاری مدد کروں گا۔ نہایت قوی اور مضبوط مدد۔ اس واقعہ کو پیش آئے چند روز ہی ہوئے تھے کہ ورقہ کا انتقال ہوگیا۔[1]

اس واقعہ میں اگرچہ اس کا ذکر نہیں ہے کہ فرشتۂ وحی اصلی شکل میں نازل ہوا تھا یا کسی انسانی صورت میں آیا تھا لیکن حضور کا جبرئیل کو فرشتہ کہنا، اُن کی آمد سے خوف زدہ ہو جانا، اور جبرئیل کے دبانے سے آپ کا تعب زدہ ہو جانا یہ سب اس امر کے قرائن ہیں کہ فرشتۂ وحی کا نزول اپنی اصلی شکل میں ہوا تھا، ساتھ ہی اس پر غور کرو کہ حضور کا اس واقعہ سے غیر معمولی طور پر متاثر ہونا اور پھر ورقہ کا تسلی و تشفی کرنا کس طرح صاف صاف بتا رہا ہے کہ حضور کو جو وحی الٰہی پہونچی آپ پہلے سے اس سے باخبر نہیں تھے اور یہ جو کچھ ہوا محض خدا کے حکم سے اور آپ کے اپنے ارادہ کے بغیر ہوا۔ کیا سیدِ کونین کے پیغمبر ہونے اور آپ کے پیغام کے وحی الٰہی ہونے کی کوئی نفسیاتی دلیل اس سے بڑھ کر ہو سکتی ہے؟

---

[1] اس واقعہ میں ورقہ بن نوفل نے جو کچھ کہا ہے اور جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی ہے اُس کے پیش نظر تمام علماء اسلام کا اتفاق ہے کہ وہ مومن تھے۔ یہاں تک کہ بعضوں نے تو اُن کو صحابہ میں بھی شمار کیا ہے البتہ اس میں تردد ہے کہ آیا وہ اس اُمت میں بھی شمار ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ دعوتِ اسلام کے ظہور سے پہلے ان کی وفات ہوگئی تھی۔

چھٹا طریقۂ وحی | ایک طریقۂ وحی یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی فرشتہ یا آواز کے توسط کے براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر وحی نازل فرمائے جیسا کہ لیلۃ المعراج میں پانچ نمازوں کو فرض کیا گیا۔

ساتواں طریقہ وحی | ایک طریقۂ وحی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی فرشتہ کی وساطت کے بغیر کلام کرے جیسا کہ از روئے نصِ قرآن حضرت موسیٰ کے لئے ثابت ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیۓ بھی معراج میں ثابت ہے۔

حافظ ابن قیم وحی کے یہ سات طریقے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ بعض علماء نے ان طریقوں پر ایک اور طریقہ کا اضافہ کیا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ پس پردۂ وحجاب نہیں بلکہ تمام حجابوں کو اٹھا کر نظروں کے سامنے جلوہ نما ہو اور شرفِ خطاب وکلام عطا فرمائے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ یہ طریقۂ وحی ان لوگوں کے نزدیک تو متحقق ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ سیدِ اولادِ آدم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم مبارک دیدارِ الٰہی سے شاد کام و فائز المرام ہوئی تھی، لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ مسئلہ علماء سلف وخلف میں مختلف فیہ رہا ہے (روایتیں دونوں قسم کی ہیں) اگرچہ اس بارہ میں جمہور صحابہ بلکہ سب کے سب ہی حضرت عائشہ کے ساتھ کما حکاہ عثمان بن سعید الدارمی[له]۔

آنحضرت اور مسئلۂ رویت باری کی تحقیق | سورۂ النجم میں جو آیات وحی سے متعلق ہیں چونکہ ان میں رویتِ باری کا بھی ذکر آیا ہے۔ اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر اس موقع پر اس مسئلہ کو کسی قدر تفصیل سے بیان کردیا جائے جیسا کہ علامہ ابن قیم نے فرمایا ہے یہ مسئلہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ کو معراج میں باری تعالیٰ کی رویتِ بصری ہوئی تھی یا نہیں، علماء سلف وخلف میں مختلف رہا ہے اور وجہ اختلاف یہ ہے کہ آثار وروایات مثبت ومنفی دونوں طرح کی ہیں یہ صحیح ہے کہ حضرت عائشہ کا مسلک اس باب میں یہی تھا

له زاد المعاد ج ۱ ص ۲۵

کہ وہ رویت کی نفی کرتی تھیں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت مسروق سے روایت ہے کہ میں حضرت عائشہ کے پاس ٹیک لگائے بیٹھا تھا کہ ام المومنین نے فرمایا، "ابو عائشہ! تین باتیں ایسی ہیں جن میں سے اگر کسی ایک کا بھی کوئی شخص قائل ہوا تو اُس نے خدا پر بڑا بہتان باندھا"، میں نے پوچھا، "وہ کیا باتیں ہیں؟" ارشاد ہوا، "جس شخص نے یہ کہا کہ محمدؐ نے خدا کو دیکھا اُس نے خدا پر بڑی تہمت لگائی"، مسروق کہتے ہیں میں تکیہ لگائے بیٹھا تھا یہ سن کر اٹھ بیٹھا اور عرض کیا، "اے ام المومنین! آپ ذرا مجھ کو مہلت دیجئے اور جلدی نہ کیجئے کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا

لقد راٰہ بالافق المبین ولقد راٰہ	اور آپ نے اُس کو اُفق مبین پر دیکھا اور آپ نے
نزلۃً اُخریٰ	اُس کو دوبارہ اُترتے ہوئے دیکھا۔

حضرت عائشہ نے جواب دیا، "سب سے پہلے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی نسبت سوال کیا تھا، تو آپ نے فرمایا کہ اس سے مراد جبرئیل علیہ السلام ہیں جن کو میں نے ان دو مرتبوں کے علاوہ ان کی اصلی شکل میں کبھی نہیں دیکھا، میں نے اُن کو آسمان سے اُترتے ہوئے اس طرح دیکھا کہ انھوں نے زمین و آسمان کے درمیان کی تمام فضا کو گھیر لیا تھا"، اس کے بعد ام المومنین نے فرمایا، "کیا تم نے نہیں سنا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لا تدرکہ الابصار وھو یدرک	نگاہیں اُس کو نہیں پاسکتی اور وہ نگاہوں کو
الابصار وھو اللطیف الخبیر	پالیتا ہے اور وہ لطیف و خبیر ہے۔

کیا تم نے نہیں سنا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

ما کان لبشرٍ ان یکلمہ اللہ الا	کسی بشر کی مجال نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس سے
وحیاً او من وراء حجابٍ او یرسل	کلام کرے، مگر وحی کے ذریعہ یا پس پردہ یا اس
رسولاً	طرح کہ وہ رسول کو بھیجے۔

اس کے برخلاف بعض روایتوں سے اس سوال کا جواب اثبات میں ملتا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت انس سے شریک بن عبداللہ نے جو روایت کی ہے اس کے آخر میں ہے۔

حَتّٰی جَاءَ سِدْرَۃَ الْمُنْتَہٰی وَ دَنَا الْجَبَّارُ	یہاں تک کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے تو عزت
رَبُّ الْعِزَّۃِ فَتَدَلّٰی حَتّٰی کَانَ مِنْہُ	ذالاجبار خدا قریب آیا یہاں تک آپ کے اور خدا
قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی (کتاب التوحید)	کے درمیان دو کمانوں یا اس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا

صحابہ میں جو حضرات رویت کا ثبوت مانتے تھے اُن میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو خاص امتیاز ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے حضرت عکرمہ کی موجودگی میں فرمایا "رَأٰی مُحَمَّدٌ رَبَّہٗ" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے رب کو دیکھا ہے۔ عکرمہ بولے کہ اللہ کا ارشاد نہیں ہے "لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ"؟ فرمایا "ہاں یہ سچ ہے لیکن اس وقت جبکہ خدا اپنے اصلی نور میں جلوہ فروز ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو دو مرتبہ دیکھا ہے" (ترمذی باب التفسیر سورۃ النجم) ترمذی میں ابوسلمہ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے آیت "وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی" کی تلاوت کرنے کے بعد فرمایا وقد رآہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

صحیح مسلم و ترمذی میں حضرت ابوذر غفاری سے روایت ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا "یا رسول اللہ آپ نے خدا کو بھی کو دیکھا ہے؟" فرمایا "وہ تو نور ہے، میں اسے کہاں دیکھ سکتا ہوں" اس روایت سے بظاہر رویت کی نفی کا مضمون ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن حضرت عبداللہ بن عباس کے الفاظ میں اس کا جواب بھی دیا جا سکتا ہے کہ آپ کا یہ فرمانا کہ میں اس کو کہاں دیکھ سکتا ہوں، اُس وقت کے لئے مخصوص ہے جبکہ خدا اپنے اصلی نور میں جلوہ فروز ہو۔ چنانچہ صحیح مسلم (ج ا باب الاسرار) اور ترمذی (تفسیر سورۃ النجم) میں ایک روایت ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "میں نے صرف ایک نور دیکھا تھا۔ گویا حضرت عائشہ جس آیت سے رویت باری

کے عدم امکان پر استدلال کرتی ہیں یعنی لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ تو حضرت ابن عباسؓ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ کے معنی یہ ہیں کہ نگاہیں حضرتِ باری عزاسمہٗ کا احاطہ نہیں کرسکتی اور وہ اس ذاتِ بے ہمتا و بے مثال کو اس طرح نہیں دیکھتیں جس طرح کہ وہ کسی ممکن چیز کو دیکھ لیتی ہیں اس بنا پر حضور پرنور کا نُورٌ أَنّٰى أَرَاهُ فرمانا بھی اسی مراد پر محمول کرنا چاہئے۔

پھر وہ حضرات جو ثبوتِ رویت کے قائل ہیں، اُن کا ایک استدلال یہ بھی ہے کہ قرآن مجید کی نص۔

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ — اس دن چہرے تر و تازہ ہوں گے اور اپنے رب کو دیکھ رہے ہوں گے۔

اور دوسری آیات و احادیث کے مطابق اہل سنت والجماعت کے نزدیک اتنا تو مسلّم ہے ہی کہ آخرت میں اہل جنت کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ پس جب آخرت میں عام اہلِ جنت دیدار الٰہی کی نعمت و دولت سے شرف اندوز ہوسکتے ہیں تو اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں یہ امتیاز حاصل ہوگیا ہو تو اس میں استبعاد کی کیا بات ہے۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس نزاع کو دور کرنے کی ایک صورت یہ تجویز کی ہے کہ حضرت ابن عباس سے اس معاملہ میں جو روایات منقول ہیں وہ دو طرح کی ہیں ایک مطلق اور دوسری مقید۔ مطلق تو وہی روایات ہیں جو اوپر گذر چکیں، اور جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مطلق دیدار الٰہی کا خواہ چشمِ ظاہر کے ذریعہ ہو یا چشمِ قلب سے، ذکر ہے۔ ان روایات کے ساتھ ہی بعض روایات ہیں جن میں مطلق نہیں بلکہ مقید رویت کا ذکر ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ابوالعالیہ کی سند سے مذکور ہے کہ حضرت ابن عباس نے۔۔ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ کی تفسیر میں فرمایا۔

رأی ربّہٗ بفؤادہٖ مرّتین آنحضرتؐ نے اپنے رب کو چشمِ قلب سے دو مرتبہ دیکھا

حضرت عطا کی سند سے ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا

رآہ بقلبہٖ آنحضرت نے خدا کو اپنے قلب کی آنکھ سے دیکھا تھا

ابن مردویہ نے اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ بطریق عطا نقل کیا ہے۔

لم یرہٗ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو آنکھ سے

بعینہٖ انّما راٰہ بقلبہٖ[1] نہیں دیکھا، بلکہ دل سے دیکھا تھا۔

پس حضرت ابن عباس کی جن روایتوں میں مطلق رویت کا ذکر ہے۔ اور چشم یا قلب کسی کی تصریح نہیں ہے۔ اگر مقید روایات کے پیشِ نظر ان کو بھی رویت بالفواد پر محمول کر لیا جائے اور ساتھ ہی حضرت عائشہ کی روایات میں جو رویت کی نفی ہے۔ اُس کو رویت بالعین پر محمول کر لیا جائے تو اب کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ ثبوتِ رویت جس اعتبار سے ہے اُس اعتبار سے نفی رویت نہیں اور حضرت عائشہ جس رویت کی نفی کرتی ہیں یعنی رویت بالبصر حضرت ابن عباس اُس کے قائل نہیں۔

ظاہر ہے کہ جہاں تک روایات و آثار کا تعلق ہے۔ حافظ ابن حجر کی اس تقریر سے حضرت ابن عباس اور ام المومنین حضرت عائشہ کے اس نزاع کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ قرآن مجید سے تو رویت بصری کا پتہ چلتا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

مازاغ البصر وماطغیٰ قوت بینائی میں نہ تو کجی پیدا ہوئی اور نہ اس نے سرکشی کی۔

ہماری رائے میں اس موقع پر حضرت الاستاذ مولانا السید محمد انور شاہ الکشمیری نے جو تقریر

[1] فتح الباری جدید اڈیشن ج ۸ ص ۴۹۳

کی ہے وہ اس مشکل کا بہترین حل ہے ہم اُسے مختصراً ذیل میں نقل کرتے ہیں، آپ فرماتے ہیں

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یقیناً رویت ہوئی تھی۔ لیکن بات یہ ہے کہ رویت ایک طرح کی ہی نہیں ہوتی بلکہ اُس کی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں نوعیتوں کے اس اختلاف کی وجہ سے ایک طرح کی رویت کا ثبوت دوسری نوع کی رویت کی نفی ہو سکتا ہے مثلاً ایک دوست اپنے دوست کو دیکھتا ہے ایک خادم اپنے مخدوم کو دیکھتا ہے۔ ایک ادنیٰ درجہ کا آدمی ایک جلیل القدر بادشاہ کی دید کرتا ہے آپ دیکھتے ہیں کہ ان سب مثالوں میں ایک رویت دوسری رویت سے بالکل مختلف طریقہ پر پائی جا رہی ہے۔ پس اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت باری عز اسمہٗ کی جو دید ہوئی تھی وہ ایک خاص طرح کی دید تھی جس کو ہم دنیا کی کسی دید پر بھی قیاس نہیں کر سکتے۔ اس بنا پر ہمارا دید کا اثبات اور نفی دونوں صحیح ہوں گے۔ اثبات ایک خاص دید کے لحاظ سے ہے اور نفی دنیوی دید کے اعتبار سے۔ اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ اثبات و نفی رویت میں تنافی اور تضاد نہیں ہے بلکہ دونوں مراد کی ایک ایک طرف کو ظاہر کرتے ہیں"

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رویتِ باری کو اگر تمثیلاً بیان کیا جا سکتا ہے تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی چشمِ اشتیاق و تمنا نے ذاتِ احدیت کے جمالِ بے مثال کا نظارہ اس طرح کیا کہ جس طرح ایک عاشق اپنے محبوب کا یا ایک باادب نوکر اپنے آقا کا کرتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں دیکھنے والا اپنی نگاہ کو روک بھی نہیں سکتا، اور ساتھ ہی اسکی مجال یہ بھی نہیں ہوتی کہ وہ آنکھیں جما کر مشاہدہ کرے۔ قرآن مجید میں اس رویت کے سلسلہ میں جو مازاغ البصر وَمَا طَغٰی" فرمایا گیا ہے۔ تو اُس میں رویت کی اس خاص کیفیت و نوعیت کی ہی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ چنانچہ "مازاغ" کا مطلب یہ ہے کہ چشمِ محمدی نے جمالِ الٰہی کے دیکھنے میں تغافل و تسامح کو بالکل روا نہیں رکھا۔ پھر "ماطغیٰ" سے مراد یہ ہے کہ باوجود کمالِ اشتیاق کے چشمِ محمدی کے لئے یہ

ناممکن تھا کہ وہ دائرۂ ادب سے باہر قدم رکھے۔ یعنی اپنی نگاہیں جمالِ ربّانی پر جمادے۔ کسی عربی شاعر نے کہا ہے۔

اَشْتَاقُہٗ فَاِذَا بَدَا   اَطْرَقْتُ مِنْ اِجْلَالِہٖ

ترجمہ:۔ میں اُس کا مشتاقِ دید ہوں، لیکن جب وہ ظاہر ہوتا ہے تو میں اُس کی جلالتِ شان کی وجہ سے سرنگوں ہو جاتا ہوں

قرآن اور وحی

چونکہ تمام اعتقادات اور ایمان وعمل کا دارومدار اس یقین پر ہے کہ پیغمبر کی زبانِ حق ترجمان سے جو کچھ ادا ہو رہا ہے وہ منجانب اللہ ہے اور جن احکام کے اتباع کا حکم دیا جارہا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے ہی ارشاد فرمائے ہوئے ہیں اس لئے ہر آسمانی مذہب کا فرض ہے کہ وہ اپنے احکام کی تعلیم وتلقین سے پہلے لوگوں کو اپنے آسمانی ہونے کا یقین دلائے۔ اور اسلام چونکہ دنیا کا آخری اور سب سے زیادہ کامل ومکمل مذہب ہے اور اُس کی دعوت کسی خاص ملک وقوم کے لئے نہیں بلکہ تمام بنی نوعِ انسان کے لئے ہے۔ اس بنا پر تمام سماوی ادیان ومذاہب میں یہ امتیازِ خصوصی صرف قرآنِ مجید کو حاصل ہے کہ جس تکرار وتاکید سے اُس نے اپنا مُنزّل من اللہ ہونا بیان کیا ہے کسی اور کتاب نے اپنی نسبت اس شد ومد اور تاکید وتکرار سے نہیں بیان کیا۔

قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر تحدی جو لوگ اُس کے مُنزّل من اللہ ہونے پر شک کرتے ہیں انکو تحدّی کی گئی۔ ارشاد ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا	اور اگر تم کو کچھ شبہ ہو اُس چیز کے متعلق جو ہم نے اپنے
فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَ	بندے پر نازل کی ہے تو اُس جیسی کوئی سورۃ
كُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ	لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے گواہوں کو بلا لو اگر
	تم سچے ہو۔

پھر اسی پر ہی بس نہیں بلکہ سخت تہدید کے انداز میں فرمایا جاتا ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ (بقرہ)

اور اگر تم ایسا نہ کر و (یعنی قرآن کی کسی سورت کا مثل نہ لاؤ) اور تم ایسا ہرگز نہیں کر سکتے تو ڈرو اُس آگ سے جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہونگے جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

ایک مقام پر ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (بنی اسرائیل)

(اے نبی) آپ کہہ دیجئے کہ اگر انسان اور جن اس قرآن کا مثل لانے پر متفق ہو جائیں تب بھی وہ اس کا مثل نہیں لا سکیں گے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہو جائیں۔

ایک جگہ قرآن مجید کو منزل من اللہ نہ ماننے والوں کو جو اُسے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام کہتے تھے اس طرح تحدی کی گئی ہے۔

ام يقولون افتراه قل فاتوا بسورة من مثله وادعوا من استطعتم من دون الله ان كنتم صادقين (یونس)

کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے (نبی نے) خود اسے گھڑ لیا ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ اچھا اگر ایسا ہے تو تم اس جیسی ایک سورۃ تو لے آؤ اور اللہ کے سوا جن کو تم بلا سکتے ہو بلا لو اگر تم سچے ہو۔

یہ لوگ جو قرآن مجید کو اللہ کا کلام نہیں مانتے ان کی نسبت فرمایا گیا کہ یہ محض اپنی کوتاہ علمی اور ناواقفیت کے باعث ایسا کہتے ہیں۔ اور اس امر کی نسبت جھوٹ بولتے ہیں جسے یہ خود نہیں جانتے۔ آیت بالا کے بعد ہی ارشاد ہوتا ہے۔

بل كذبوا بما لم يحيطوا بعلمه ولما

بلکہ اُنھوں نے ایسی چیز کی تکذیب کی ہے جس کے

یاتِھِمۡ تاویلُہٗ ط کذٰلک کذّب الّذِین من قبلھم فانظر کیف کان عاقبۃ الظّٰلِمِین (یونس)

علم کا احاطہ انھوں نے نہیں کیا، اور جس کی اصل حقیقت ان کے سامنے نہیں آئی، اسی طرح ان لوگوں سے پہلے بھی لوگوں نے تکذیب کی ہے پس آپ دیکھئے کہ ظالموں کا انجام کیا ہوا۔

ایک جگہ فرمایا گیا ہے۔

ام یقولون افتراہ ط قل فاتوا بعشر سورٍ مثلِہٖ مفتریٰت وادعوا من استطعتم من دون اللّٰہ ان کنتم صادقین۔ فان لم یستجیبوا لکم فاعلموا انّما اُنزِلَ بعلمِ اللّٰہِ وَاَنۡ لا اِلٰہَ اِلّا ھُوَ فھل انتم مسلمون (ہود)

کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے خود قرآن گھڑ لیا ہے، آپ کہہ دیجئے کہ اچھا اس طرح کی دس گھڑی ہوئی سورتیں ہی لے آؤ اور اللہ کے سوا جن لوگوں کو تم بلا سکو بلا لو اگر تم سچے ہو، اور اگر وہ کچھ جواب نہ دیں تو جان لو کہ وہ اللہ کے علم سے اتارا گیا ہے اور یہ کہ سوائے خدا کے کوئی دوسرا معبود نہیں ہے، تو کیا تم اطاعت قبول کرنے والے ہو۔

اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان منکرین کی ہوا پرستی کا اس طرح یقین دلایا جاتا ہے

فان لم یستجیبوا لک فاعلم انّمَا یتبعون اھواءَھُمۡ ومن اَضَلّ مِمّن اتبع ھواہ بغیر ھدًی من اللّٰہ ان اللّٰہ لا یھدی القوم الظّٰلِمِین (القصص)

(اے محمدؐ) اگر وہ لوگ آپکو جواب نہ دیں تو آپ جان لیں کہ یہ لوگ صرف اپنی خواہشوں کا اتباع کرتے ہیں اور ان لوگوں سے زیادہ گمراہ کون ہے جو اللہ کی ہدایت کے بغیر اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہوں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ ظالموں

باقی صفحہ ۶۴ پر

بعض جزئی واقعات سے قرآن مجید کے وحی ہونے پر استدلال

یہ آیات جو اوپر گذریں ان میں قرآنی اعجاز کو پیش کر کے سخت ترین تحدی کی گئی ہے اور منکرین کے عجز سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں، بلکہ اللہ کی طرف سے نازل کی ہوئی وحی ہے۔ ان آیات کے علاوہ بکثرت دوسری آیتیں بھی ہیں جن میں قرآن مجید کے وحی ہونے پر بعض جزئی واقعات اور قرآن مجید کے مضامین و مطالب سے استدلال کیا گیا ہے مثلاً

ام یقولون تقولہ بل لا یومنون فلیاتوا بحدیث مثلہ ان کانوا صدقین (الطور)

یا یہ کہتے ہیں کہ (پیغمبر) قرآن مجید خود بنا لائے ہیں (کوئی نہیں) بلکہ یہ لوگ ایمان نہیں لائے ہیں۔ اب ان کو چاہئے کہ کوئی بات اسی طرح کی لے آئیں اگر وہ سچے ہیں۔

حضرت یوسف کا واقعہ بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

ذالک من انباءِ الغیبِ نوحیہ الیک وما کنت لدیھم اذ اجمعوا امرھم وھم یمکرون (یوسف)

یہ غیب کی خبریں جو ہم آپ پر وحی کرتے ہیں اور آپ (اے محمد) ان کے پاس نہیں تھے جب انھوں نے اپنی کوشش مرکوز کرلی اور وہ تدبیریں کرنے لگے۔

حضرت مریم کے واقعہ کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے۔

ذالک من انباء الغیب نوحیہ الیک وما کنت لدیھم اذ یلقون اقلامھم ایھم یکفل مریم وما کنت لدیھم اذ یختصمون (مریم)

یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کے پاس وحی کرتے ہیں اور آپ اُن لوگوں کے پاس نہیں تھے جب وہ قرعہ اس غرض سے ڈال رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کریگا اور آپ اُن کے پاس نہیں تھے

اس آیت کو ذرا غور سے پڑھئے اور دیکھئے کہ اس میں دو مرتبہ "وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ" فرما کر اس بات پر زور ڈالا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود حضرت مریم کی کفالت پر بحث و تکرار کے وقت موجود نہیں تھے۔ تو اب قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر آپ کو اس واقعہ کا علم کس طرح ہوا؟ قرآن مجید اس کا جواب دیتا ہے کہ "نوحیہ الیک" ہم آپ پر اس کی وحی بھیجتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی گذشتہ واقعہ کو معلوم کرنے کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اس کو کسی اخبار یا کتاب میں پڑھا ہو۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی سے سننے کا اتفاق ہوا ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان دونوں میں سے کوئی ایک صورت بھی متحقق نہیں تھی۔ پہلی صورت کی تو آپ نے خود "لست بقارئ" میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، فرما کر نفی کر دی۔ اور آپ کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اس کی تردید نہیں کر سکا۔ اب رہی دوسری صورت یعنی یہ کہ آپ کو کسی نے یہ واقعات غیب سنائے ہوں تو قرآن مجید اس کی تردید اس طرح کرتا ہے۔ حضرت نوح کے قصہ کے بعد ارشاد ہے۔

تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا	یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ پر وحی
إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا	کرتے ہیں، اس سے پہلے نہ آپ اس کو جانتے
قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا فَاصْبِرْ إِنَّ	تھے اور نہ آپ کی قوم، آپ صبر کیجیے! کوئی شبہ
الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ (ہود)	نہیں کہ عاقبت پرہیزگاروں کے لئے ہی ہے۔

پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان دونوں میں سے کوئی ایک ذریعۂ علم بھی نہیں ہے۔ تو اب قرآن کا دعویٰ "نوحیہ الیک" کے تسلیم کرنے میں کیا تذبذب ہو سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ کے واقعہ کے سلسلہ میں فرمایا گیا ہے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَا	اور (اے نبی) آپ طور کی جانب غربی میں نہیں
إِلَىٰ مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ	تھے جب ہم نے موسیٰ کی طرف اپنا فیصلہ نازل

الشّٰهِدِيْنَ (القصص) کیا اور آپ اُس وقت وہاں موجود نہ تھے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا

وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ لیکن ہم نے بہت سی جماعتیں پیدا کیں اور ان
الْعُمُرُ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ پر دراز مدتیں گذر گئیں اور آپ مدین والوں
تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا وَلٰكِنَّا كُنَّا میں نہ رہتے تھے کہ اُن کو ہماری آیات سناتے
مُرْسِلِيْنَ (القصص) لیکن ہم رسول بھیجتے رہے ہیں۔

اس آیت کے بعد جو آیت ہے اس میں بھی اس مضمون کا اعادہ کیا گیا ہے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا اور آپ طور کے کسی کنارہ پر نہیں تھے جب ہم
وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ نے ندا دی لیکن آپ کو یہ واقعہ محض اپنے رب کی
قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ رحمت سے معلوم ہوا ہے تاکہ آپ اس قوم کو ڈرائیں،
قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ جس کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں
آیا تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

عرب کی گذشتہ قوموں کے حالات سنانے کے بعد ارشادِ حق بنیاد ہے۔

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ یہ آبادیاں وہ ہیں جن کے کچھ حالات ہم آپ
اَنْۢبَآئِهَا کو سناتے ہیں۔

سورۂ عنکبوت کی آیت ذیل میں اسی مضمون کو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس انسانی ذرائع علم میں سے کوئی ذریعہ نہیں تھا، اور آپ کا ذریعۂ علم صرف وحی الٰہی تھا اور زیادہ واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ نزول قرآن سے پہلے نہ تو آپ کوئی کتاب

ولا تخطّہٗ بیمینك اذا لارتاب — پڑھتے تھے اور نہ اپنے داہنے ہاتھ سے لکھتے

المبطلون — تھے، اگر ایسا ہوتا تو ان باطل پرستوں کے لئے

شبہ کی گنجائش بھی نکلتی

اس آیت میں صراحۃً اس بات کا اعلان کر دیا گیا ہے کہ آپ نزولِ قرآن سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ لکھ سکتے تھے۔

ایک مقام پر ارشاد ہے۔

وَکذٰلك اَوْحَیْنَا الیك رُوْحًا — اور اس طرح ہم نے آپ کے پاس اپنے حکم سے روح

مِنْ امرِنا ماکُنْتَ تدری ما الکتٰبُ — بھیجی۔ آپ جانتے ہی نہیں تھے کہ کتاب کیا ہے

ولا الایمان (شوریٰ) — اور ایمان کیا ہے۔

اب ایک احتمال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ یہ غیبی اطلاعات آپ نے کسی سے سُنی ہوں تو اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مکہ معظمہ میں دو قسم کے لوگ آباد تھے ایک مشرکین اور دوسرے اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ۔ مشرکین چونکہ کوئی کتاب نہیں رکھتے تھے اسلئے انکو انبیار متقدمین کا کوئی واقعہ بھی معلوم نہیں تھا، چنانچہ حضرت مریم کے قصہ میں "ماکُنْتَ تعلمہا انت ولا قومُكَ" فرما کر اسی امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اب رہے مکہ کے اہل کتاب یہود و نصاریٰ تو اس میں شبہ نہیں کہ ان لوگوں کی آسمانی کتابوں میں بعض انبیار کے واقعات کا تذکرہ ضرور ہے لیکن سید کونینؐ کے بڑے سے بڑے دشمن بھی جانتے تھے کہ آپ نبوت سے پہلے ان لوگوں سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ اور اس لئے کوئی شخص ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں کر سکتا تھا کہ آپ کو ان غیبی قصص و واقعات کا علم یہود و نصاریٰ کے ذریعہ ہوا ہے۔ دشمنوں نے آپ کی تکذیب میں کیا کچھ کہا۔ لیکن قرآن کے ادعار "نقصُّ علیك" یا "نوحیہ الیك" کے جواب میں یہ کہنے کی جسارت کسی ایک کو بھی نہیں ہوئی کہ آپ فلاں وقت

یا فلاں مقام پر کسی عیسائی یا یہودی سے قصہ سُن رہے تھے۔ لے دے کے عیسائیوں کے پاس بحیرا راہب کا ایک افسانہ ہے۔ جو اوّل تو ثابت نہیں۔ اور اگر ثابت مان بھی لیا جائے تو کیا دنیا کا کوئی معمولی عقل کا انسان بھی اسے باور کرسکتا ہے کہ راہب نے چند منٹوں میں ہی آپ کو جبکہ آپ کی عمر بارہ تیرہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اور آپ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ شام کے سفر پر جارہے تھے وہ سب کچھ بتادیا جو قرآن مجید کے دو دفتوں کے درمیان ہے۔ اور پھر آپ نے اُس کو بغیر لکھے ہی مِن وعَن گوشہ حافظہ میں محفوظ کرلیا اور لطف یہ ہے کہ آپ شام سے واپس آتے ہیں۔ اور اس کے بعد (نبوت سے قبل تک) ستائیس اٹھائیس سال مکہ میں رہتے ہیں اپنے قبیلہ کے لوگوں کیساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہیں اور اس کے باوجود راہب کے سُنائے ہوئے واقعات کو چہل سالگی کی عمر تک بالکل حرفِ راز کی طرح سینہ میں پوشیدہ رکھتے ہیں۔ اشارۃً وکنایۃً بھی کسی سے کسی واقعہ کا ذکر نہیں آتا اور چالیس سال کی عمر کے بعد یکایک غیبی اطلاعات کا سمندر اُمنڈ پڑتا ہے۔ یا للعجب

بہرحال یہ احتمال چونکہ اس درجہ کمزور تھا کہ آپ کے دشمنوں کے حاشیۂ خیال میں بھی موجود نہیں تھا اس لئے قرآن مجید نے اس سے سکوت کیا۔

عدم اختلاف سے قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر استدلال

جزئی واقعات کے علاوہ قرآن مجید میں اختلاف کے نہ ہونے سے بھی اُس کے منزل من اللہ ہونے پر استدلال کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

افلا یتدّبرون القرآن ط ولو	کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے، اور اگر
کان من عندِ غیرِ اللّٰہ لوجدوا فیہ	یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وُہ
اختلافاً کثیراً (نساء)	اس میں کثیر اختلاف پاتے۔

اہل کتاب قرآن کے منزل من اللہ ہونے سے باخبر ہیں

اہل کتاب اگرچہ زبان سے انکار کرتے تھے، لیکن دل میں وہ بھی جانتے تھے کہ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ

خود اہل کتاب تھے اور اس بنا پر کلام الہٰی اور وحی ربّانی کے مفہوم سے یکسر بیگانہ نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کی تسکین کے لئے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَالَّذِينَ آتَيْنٰهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ	اور وہ لوگ جنکو ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے
أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ	ہیں کہ یہ قرآن آپ کے رب کی طرف سے حق
فلا تكونن مِنَ الْمُمْتَرِينَ (البقرہ)	کے ساتھ نازل ہوا ہے پس آپ شک کرنیوالوں میں سے نہ ہوں

ایک دوسری آیت میں ہے۔

ويرى الَّذِينَ اوتوا العِلْمَ	اور وہ لوگ جنھیں علم دیا گیا ہے وہ جانتے ہیں
الَّذِی انزل اليكَ من رَّبِّكَ	کہ جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی جانب سے
هُوَ الحق۔ (سبا)	نازل کیا گیا ہے وہی حق ہے

ایک اہل کتاب کی شہادت کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی۔

لیکن چونکہ اُس زمانہ میں عرب کے جاہل مشرکین بنو اسرائیل کے علم و فضل سے مرعوب تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن کے کتاب الہٰی ہونے کی تردید و تکذیب کیلئے ان علمار کا سہارا ڈھونڈھتے تھے جس میں ان کو ہمیشہ ناکامی اس بنا پر ہوتی تھی کہ خدا نے خود ان علمار کی زبان سے آنحضرت کی رسالت اور قرآن کے وحی ہونے کی تصدیق کرا دی تھی بلکہ ان میں بعض علمار تو ایسے تھے جنھوں نے سرکارِ دوعالم کا رُوئے انور دیکھتے ہی سرِ اطاعت و تسلیم خم کر دیا اور بے ساختہ بول اُٹھے "إِنَّ هٰذَا الوجهَ ليس بوجهِ كاذبٍ" بے شبہ یہ چہرہ کوئی کاذب چہرہ نہیں ہے"، اس لئے ان منکرینِ وحی کو عار دلانے اور قرآن مجید کے وحی الہٰی ہونے کی حقیقت کو اُن پر بطور الزام ثابت کرنے کے لئے ایک عالم بنی اسرائیل (عبداللہ بن سلام) کی شہادت کو بھی اہتمام کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ	آپ فرمائیے بھلا دیکھو تو اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے
وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ	آیا ہو۔ اور تم نے اس کو نہیں مانا اور بنو اسرائیل
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَ	کا ایک گواہ اس کی گواہی بھی دے چکا اور وہ
اسْتَكْبَرْتُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ	ایمان لے آیا (مگر) تم نے غرور کیا، بے شک اللہ
الظّٰلِمِيْنَ (الاحقاف)	ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

سورۂ بنی اسرائیل میں اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ۭ اِنَّ	آپ کہئے! تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ جن لوگوں کو قرآن
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى	سے پہلے علم ملا ہے ان پر جب اس قرآن کی تلاوت
عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا وَّ	کی جاتی ہے تو وہ اپنی ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں
يَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ	گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں پاک ہے ہمارا رب اس
رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا	کا وعدہ ہو کر رہا۔[1]

ایک آیت میں مشرکین سے پوچھا گیا ہے کہ کیا علمائے بنی اسرائیل کا قرآن کی حقیقت سے آگاہ ہونا تمہارے لئے خدا کی کوئی نشانی نہیں ہے؟

---

[1] اس آیت کا مفاد بھی یہ جتانا ہے کہ قرآن کی حقانیت اور آنحضرت صلعم کی نبوت کی تصدیق وہ انصاف پسند ارباب علم کر رہے ہیں جنہیں پچھلی کتابوں کی بشارتوں سے واقفیت ہے" وعداللہ" سے اشارہ اس وعدہ ربانی کی طرف ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی زبانی توراۃ کتاب استثنا میں اس طرح کیا گیا تھا۔ اے بنی اسرائیل میں تمہارے بھائیوں (بنی اسمٰعیل) میں سے ایک نبی اٹھاؤں گا جس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا، علمائے اہل کتاب قرآن مجید کو سن کر فوراً سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور وہ یقین کرتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وہی رسول مبشر بہ ہیں اور قرآن وہی کلام خداوندی ہے جس کا ذکر توراۃ میں کیا گیا ہے۔

اَوَلَمْ يَكُن لَّهُمْ آيَةً اَن يَّعْلَمَهُ عُلَمَاءُ بَنِي اِسْرَائِيلَ (الشعراء)

کیا ان کے لئے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ اس کو علما بنی اسرائیل جانتے ہیں

مشرکین وحی سے بیگانہ تھے لیکن جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، اہل کتاب وحی اور کلام الٰہی کی حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ خود اُن کی آسمانی کتابوں کی پیش گوئیوں اور بشارتوں کے مطابق بنو اسمٰعیل میں ایک نبی پیدا ہوگا اور اپنے ساتھ اللہ کی ایک کتاب بھی لائے گا۔ پس اگر یہ لوگ بھی قرآن کو وحی ماننے سے انکار کریں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان نہ لائیں تو ظاہر ہے ان سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوسکتا ہے، چونکہ اسلام قبول کرنے کی توقع مشرکین کی بہ نسبت ان لوگوں سے زیادہ تھی اس لئے خدا نے حکم دیا کہ مسلمانوں کا معاملہ اہل کتاب کے ساتھ نرمی کا ہونا چاہئے۔ مسلمانوں کو ان سے کہنا چاہئے کہ تم کو قرآن کے وحی ماننے میں کیا تامل ہے۔ آخر تم بھی تو ہماری طرح ایک کتاب الٰہی پر ایمان رکھتے اور اُسے منزل من اللہ مانتے ہو۔ دیکھئے! کس بلیغ پیرایہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَا تُجَادِلُوٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوٓا اٰمَنَّا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَاُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۔ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَآءِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِهٖ ۚ وَمَا

اور تم اہل کتاب سے صرف بطریق احسن مجادلہ کرو ان میں سے اُن لوگوں کے سوا جنھوں نے (انکار حق کرکے) ظلم کیا ہے اور ان سے کہو کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اُس کتاب پر جو تم پر نازل کی گئی اور اُس پر بھی جو ہم پر نازل کی گئی ہو اور ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہے اور ہم اُس کے مطیع و فرماں بردار ہیں، اور اسی طرح ہم نے (اے محمدؐ) آپ پر کتاب نازل کی۔ پس جن لوگوں کو ہم نے کتاب

يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الْكَافِرُونَ (عنکبوت) — دے رکھی تھی اور اس پر ایمان لے آئے ہیں اور ان اہل مکہ میں سے بھی بعض وہ ہیں جو اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں ہماری آیات سے جحود و انکار تو کافر ہی کرتے ہیں۔

مشرکین کے اعتراضات کی تردید | پھر ان استدلالات و ترغیبات پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ بعض وہ دیگر وہن مشرکین و کفار قرآن کی اس حیثیت پر جو اعتراضات کرتے تھے۔ ان سب کے بھی جوابات دیئے گئے ہیں۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ اگر قرآن اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں نسخ نہ پایا جاتا۔ قرآن اس کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مُفْتَرٍ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (النحل) — اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جو کچھ نازل کرتا ہے وہ اسے خوب جانتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کلام گھڑنے والے ہیں (نہیں) بلکہ ان میں سے اکثر جانتے ہی نہیں ہیں۔

اور آنحضرت کو اس کے جواب میں یہ کہنے کا امر کیا جاتا ہے۔

قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِينَ آمَنُوا وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ (النحل) — آپ کہہ دیجئے کہ اس قرآن کو میرے رب کی طرف سے روح القدس لیکر آئے ہیں تاکہ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں ان کو ثابت قدمی حاصل ہو اور مسلمانوں کے لئے ہدایت اور بشارت ہو۔

بعض کہتے تھے کہ حضور کا کوئی معلم ہے جو آپ کو یہ تمام باتیں سکھاتا ہے۔ اس قول میں یہ بہتان

طرازخود دو قسم کے لوگ تھے۔ کوئی کسی نصرانی غلام کو معلم بتاتا تھا۔ اور کوئی کسی یہودی غلام کا نام لیتا تھا۔ لیکن تھے یہ دونوں غلام عجمی۔ اگر مشرکین کا یہ "معلم" عربی ہوتا تو وہ متعین طور پر اس کا نام لے سکتے تھے۔ قرآن مجید میں کفار کی اس بہتان طرازی اور اس کی تردید کا بیان اس طرح ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُولُونَ اِنَّمَا	اور ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مشرکین کہتے ہیں
يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ ط لِسَانُ الَّذِى يُلْحِدُونَ	آپکو ایک انسان قرآن سکھاتا ہے (حالانکہ) جس
اِلَيْهِ اَعْجَمِىٌّ وَهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِىٌّ	شخص کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں وہ عجمی ہے اور
مُبِينٌ (النحل)	قرآن کی زبان صاف اور واضح عربی ہے

اس کے بعد ان لوگوں کے جھوٹ پر مہر توثیق اس طرح ثبت کی گئی ہے۔

اِنَّمَا يَفْتَرِى الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا	یہ جھوٹ کا افترا وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ کی
يُؤْمِنُونَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ	کی آیات پر ایمان نہیں لاتے اور یہی وہ لوگ
هُمُ الْكٰذِبُونَ (النحل)	ہیں جو جھوٹے ہیں۔

بعض مشرکین کا خیال تھا کہ قرآن مجید کا القا رشیاطین کی طرف سے ہوتا ہے اور عموماً کاہن (Astrologer) غیب کی خبریں بیان کرتے ہی ہیں۔ آپ بھی کاہن ہیں اور اس لئے غیب کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس وسوسۂ شیطانی کی تردید بھی نہایت پرزور الفاظ میں کی ہے ارشاد ہے۔

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ وَمَا يَنْۢبَغِىْ	اس قرآن کو شیاطین نے نہیں اتارا اور نہ یہ
لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ٥ (الشعراء)	ان کے لائق ہے اور نہ وہ ایسا کر سکتے ہیں،
وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ	اور یہ قرآن مردود شیطان کا قول نہیں ہے
فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ (التکویر)	پس تم لوگ کہاں جا رہے ہو۔

قرآن کو بعض لوگ شاعرانہ کلام کہتے تھے۔ اُس کی بھی تردید کی گئی۔

وما ہُوَ بقولِ شاعرٍ قلیلاً ما تؤمنون — اور وہ (قرآن) کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔ تم

ولا بقولِ کاہنٍ قلیلاً ما تذکّرون — بہت ہی کم ایمان لاتے ہو۔ اور نہ وہ کسی کاہن

(الحاقہ) — کا قول ہے۔ تم بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو۔

ان سب اعتراضات اور شیطانی وساوس کی تردید کے بعد اللہ تعالیٰ خود اپنی اور فرشتوں کی شہادت سے قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔

لٰکِنِ اللّٰہُ یَشْہَدُ بِمَا اَنْزَلَ اِلَیْکَ — لیکن اللہ اس کی شہادت دیتا ہے جو آپ پر نازل

اَنْزَلَہٗ بِعِلْمِہٖ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ یَشْہَدُوْنَ — کیا گیا ہے اللہ نے اُس کو اپنے علم سے اتارا ہے

وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًا (النساء) — اور فرشتے بھی گواہ ہیں (اگرچہ) شہادت کیلئے تو اللہ ہی کافی ہے

مشرکین کا کوئی اور حیلہ کارگر نہیں ہوا تو انھوں نے یہی کہنا شروع کر دیا کہ بھلا یہ معجزہ ہی کیا ہوا نبی بھی عربی اور قرآن بھی عربی۔ اصل معجزہ تو جب ہوتا کہ عربی نبی پر عجمی قرآن نازل ہوتا۔ قرآن نے مشرکین کے اس قول کی رکاکت کا بھی اظہار کیا ہے۔ فرمایا گیا ہے۔

وَلَوْ جَعَلْنٰہُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِیًّا لَّقَالُوْا — اور اگر ہم قرآن کو عجمی قران بناتے تو یہ لوگ کہتے کہ

لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰیٰتُہٗ ءَاَعْجَمِیٌّ وَّعَرَبِیٌّ — اسکی آیات مفصل کیوں نہیں ہیں بھلا زبان عجمی اور

قُلْ ہُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ہُدًی وَّشِفَآءٌ — لوگ عربی۔ آپ کہہ دیجئے کہ قرآن ایمان والوں

وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ فِیْٓ اٰذَانِہِمْ — کے لئے ہدایت اور شفا ہے اور جو لوگ ایمان

وَقْرٌ وَّہُوَ عَلَیْہِمْ عَمًی اُولٰٓئِکَ — نہیں لاتے ہیں اُن کے کانوں میں بوجھ ہے۔ اور

یُنَادَوْنَ مِنْ مَّکَانٍ بَعِیْدٍ (حٰمٓ السجدہ) — یہ قرآن اُن کے حق میں اندھا پن ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو دور دراز مقام سے پکارا جاتا ہے

بعض کفار خود اپنا منہ چڑانے کے لئے کہتے تھے کہ قرآن (معاذ اللہ) من گھڑت ہے اور دوسرے لوگوں نے اس میں آپ کی مدد کی ہے۔ قرآن اس کی بھی تردید کرتا ہے۔ ارشاد ہے۔

قال الذین کفروا اِن ھٰذا اِلّا افك افترٰہ واعانہٗ علیہ قومٌ آخرون فقد جاؤا ظلمًا وزورًا (الفرقان)	کافر کہتے ہیں کہ یہ قران تو کچھ بھی نہیں نرا بہتان ہے اور اس کے بنانے میں دوسرے لوگوں نے مدد کی ہے کوئی شبہ نہیں کہ ان لوگوں نے بالکل جھوٹ اور ظلم کی بات کہی ہے۔

اوپر جو آیات گذریں دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کے وحی ربانی ہونے کے دلائل بیان کئے ہیں اور دوسری وہ آیات ہیں جن میں قرآن مجید سے متعلق کفار و مشرکین کے بیہودہ خیالات، باطل توہمات اور شیطانی وساوس کی پُر زور تردید کی گئی ہے۔ ان آیات کے علاوہ کثرت سے ایسی آیات بھی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بالکل صاف اور واضح الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ قرآن مجید کا نزول اللہ کی جانب سے ہوا ہے۔ اس مضمون کے بار بار تکرار سے منشا یہی ہو کہ اسلامی عقائد و اعمال کا یہ اساسی عقیدہ اس طرح لوگوں کے دل و دماغ میں مرتسم ہو جائے کہ انھیں اس بارہ میں ذرا سا بھی تذبذب اور شک باقی نہ رہے۔ آیاتِ ذیل ملاحظہ کیجئے

(۱) اِنّا انزلنٰہُ فی لیلۃٍ مبارکۃٍ (دخان)	ہم نے بے شبہ اس قرآن کو مبارک رات میں اُتارا
(۲) اِنّا انزلنٰہُ فی لیلۃ القدر (قدر)	بے شبہ ہم نے اسکو شب قدر میں نازل کیا
(۳) تنزیلًا ممّن خلق الارض والسمٰوٰت العُلیٰ (طٰہٰ)	اس قرآن کا نزول اُس ذات کی طرف سے ہے جس نے زمین اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا
(۴) قُل انزلہُ الذی یعلم السرّ فی السمٰوٰت والارض (الفرقان)	آپ کہہ دیجئے کہ اس قرآن کو اُس ذات نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھیدوں سے

باقیہ

(۵) اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنْزِيلًا — ہم نے ہی قرآن مجید آپ پر ٹھہر ٹھہر کر نازل کیا ہے،

(۶) اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ — ہم نے ہی اس نصیحت (قرآن) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

پورے قرآن کو اول سے آخر تک پڑھئے تو اس مضمون کی آیات چند ایک نہیں بلکہ بہت زیادہ ملیں گی۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے اپنے وحی ہونے کے مضمون کو جس شد و مد اور تاکید و تکرار سے بیان کیا ہے دنیا کی کسی اور کتاب سماوی نے اپنے متعلق اس طرح بیان نہیں کیا۔ اس سلسلہ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو تشنۂ تکمیل رہ گیا ہو۔

حضرت جبریل کی توثیق یہ ظاہر ہے کہ وحی اللہ کی طرف سے انبیا پر عموماً حضرت جبریل کے واسطہ سے نازل ہوتی رہی ہے اور خود قرآن بھی آنحضرت پر اسی طرح نازل ہوا، اس بنا پر قرآن میں حضرت جبریل کی وساطت کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور ان کی توثیق کر کے اس شبہ کو دور کر دیا گیا ہے کہ ممکن ہے ان سے پیغام الٰہی کے پہونچانے میں کوئی تغیر و تبدل ہو گیا ہو۔ ارشاد ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرۃ) — آپ کہہ دیجئے کہ جو لوگ جبریل کے دشمن ہیں (ہوا کریں) انھوں نے ہی تو اللہ کے حکم سے آپ پر قرآن اتارا ہے۔

سورۂ نحل میں ہے۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ○ — آپ کہہ دیجئے کہ اس کو روح القدس نے میرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کیا ہے تاکہ وہ ایمان والوں کو ثابت قدم رکھے اور وہ مسلمانوں کے لئے ہدایت اور بشارت ہو۔

سورۂ شعرا میں انھیں روح الامین کہا گیا ہے جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جبریل امین کامل ہیں۔ اُن سے کسی خیانت یا کوتاہی کا اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ فرمایا گیا ہے۔

نَزَّلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ — اس قرآن کو روح الامین (جبریل) نے آپ کے
لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ — قلب پر اتارا ہے تاکہ آپ انذار کرنے والوں
(الشعراء) — میں سے ہو جائیں۔

سورۂ تکویر میں اس سے بھی زیادہ تاکید کے ساتھ حضرت جبریل کی توثیق کی گئی ہے۔ ارشاد ہے

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ذِي قُوَّةٍ — بیشک وہ معزز قاصد کا کلام ہے جو قوت والا ہے،
عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ — خدائے عرش کے نزدیک مرتبہ والا ہے۔ اُس کی
أَمِينٍ — اطاعت کی جاتی ہے اور وہاں امین معتبر ہے

سورۂ النجم میں ہے۔

عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ذُو مِرَّةٍ — آنحضرت کو سخت قوتوں والے اور زور آور
فَاسْتَوَىٰ — نے سکھایا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توثیق حضرت جبریل کے تعارف اور ان کی توثیق کے بعد ضرورت تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی توثیق کی جاتی تاکہ کسی شخص کو یہ شبہ نہ ہو کہ ممکن ہے آپ سے وحی کے پہونچانے میں کوئی کوتاہی ہو گئی ہو۔ ساتھ ہی ضروری تھا کہ اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حیثیت بھی بیان کر دی جاتی جس سے یہ معلوم ہو جاتا کہ حضور تو محض ایک پیغامبر ہیں۔ اللہ کی طرف سے آپ پر جو وحی نازل ہوتی ہے آپ اُس کو بے کم و کاست خدا کے بندوں تک پہونچانے پر مامور ہیں۔ پھر چونکہ اس منصبِ جلیل و عظیم (رسالت) کے لئے خدا نے آپ کا انتخاب کیا ہے۔ اس لئے آپ کے ذہنی اور دماغی قویٰ بھی عام انسانوں سے زیادہ بلند اور مضبوط ہیں جس کے باعث

آپ وحی میں نہ کوئی تغیر و تبدل کرسکتے ہیں اور نہ اُس کے کسی لفظ اور معنی کا مفہوم سمجھنے میں آپ سے غلطی ہوسکتی ہے۔ رب الوحی نے یہ سب باتیں بھی قرآن میں بیان کی ہیں تاکہ لوگوں پر حجت تمام ہو جائے

قرآن کا افترا کیا ہی نہیں جا سکتا | اس سلسلہ میں بعض آیات تو وہ ہیں جن میں عمومی طور پر فرمایا گیا ہے کہ یہ قرآن سوائے اللہ کے کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس عموم کے ماتحت خود سرور کائنات کی ذاتِ ستودہ صفات بھی داخل ہے۔ مثلاً یہ آیت۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى	اور یہ قرآن وہ نہیں ہو کہ اُسکو غیر خدا نے گھڑ لیا
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ	ہو۔ لیکن اُس کتاب کی تصدیق ہو جو اس سے پہلے
الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ	نازل ہوئی اور اُسکی ہی تفصیل ہو اس قرآن کے
لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ	رب العالمین کی طرف سے ہونے میں کوئی شبہ نہیں

آنحضرت صلعم کے متعلق قرآنی تصریحات | ان کے علاوہ دوسری آیات وہ ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے متعلق چند تصریحات توضیحات ہیں ہم ذیل میں انھیں نمبروار لکھتے ہیں

(۱) ایک آیت میں بتایا گیا ہو کہ آپ بھی اور انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں فرق صرف یہ ہے کہ آپ پر وحی اُترتی ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ آپ فرمادیجئے میں تمہاری طرح ایک بشر ہوں اللہ مجھ پر وحی آتی ہو۔

اور آج یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ آپ سے پہلے بھی انبیار آتے رہے اور اُن پر بھی وحی نازل ہوتی رہی ہے۔ بس آپ کا فرضِ منصبی یہی ہے کہ خدا کا پیام جوں کا توں لوگوں تک پہونچا دیں اس کے سوا آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ خود آپ کے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔ "قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ" آپ خود وحی کا اتباع کرتے ہیں اور آپ تو صرف صاف صاف ڈرانے والے ہیں۔ اسی آیت کے آخر میں ہے۔

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ

(۲) حضور کو لوگوں کے ثواب وعقاب میں بھی کوئی دخل نہیں ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ یَتُوْبَ   آپکو اس معاملہ میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ اللہ

عَلَیْهِمْ اَوْ یُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ   ان کو توبہ کی توفیق عطا فرمائے یا انکو عذاب

(نساء)   دے وہ تو بہرحال ظالم ہیں۔

(۳) حضور کو اس کا بھی علم نہیں ہے کہ خدا نے لوگوں سے جس چیز کا وعدہ کیا ہے وہ قریب ہے یا بعید ہے۔ فرماتے ہیں۔

قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ   آپ کہہ دیجئے میں نہیں جانتا کہ تم سے جس چیز

اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا   کا وعدہ کیا گیا ہے وہ قریب ہے یا نہیں، یا

(جن)   میرا رب اس کے لئے کوئی مدت مقرر کریگا؟

بعض مشرکین مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ آپ کی عام پند ونصائح تو بڑی عمدہ ہیں۔ لیکن قرآن میں بت پرستی کی جو مذمت کی جاتی ہے اس سے تکلیف ہوتی ہے۔ اسلئے آپ یا تو موجودہ قرآن کو چھوڑ کر کوئی دوسرا قرآن لے آئیے جس میں ایسی "دلخراش" باتیں نہ ہوں یا پھر کچھ اور نہیں تو اس قرآن میں ہی ترمیم اور تغیر وتبدل کر دیجئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا   جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی امید نہیں ہے یعنی

ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ   حشر کا عقیدہ نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ آپ اس

قُلْ مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ   قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آئیے یا

مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا   اس کو ہی بدل دیجئے۔ آپ فرما دیجئے کہ میں

مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ   قرآن کو اپنی طرف سے بدل نہیں سکتا۔ میں تو

عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (یونس) اُسی چیز کی پیروی کرونگا جسکی وحی مجھ کو بھیجی گئی ہے۔ اگر میں نے نافرمانی خداوندی کی تو میں اپنے رب کے سخت دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وحی کو بعینہٖ پہونچا دیتے ہیں اور اُس میں ہوا و ہوس کا بالکل دخل نہیں ہوتا۔ اعلان واجب الاذعان ہے۔

وما ینطق عنِ الھویٰ ان ھو الا وحیٌ یوحیٰ (النجم) آپ اپنی طرف سے کچھ نہیں فرماتے آپکا نطق وحی ہے جس کی آپ پر وحی ہوئی ہے۔

(۵) اور آپ نطق عن الھویٰ کر بھی نہیں سکتے۔

ولو تقوّل علینا بعض الاقاویل لاَخذنا منہُ بالیمین ثم لقطعنا منہ الوتین فما منکم من احدٍ عنہ حاجزین (الحاقۃ) اور اگر وہ (محمد) بعض باتیں بنا کر ہماری طرف منسوب کر دیتے تو ہم ضرور اُن کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے پھر اُن کی رگ کاٹ ڈالتے اور تم میں سے کوئی اُس کا روکنے والا نہ ہوتا۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے۔

ام یقولون افتریٰ علی اللّٰہِ کذباً فانِ یشا اللّٰہ یختم علیٰ قلبک ویمحُ اللّٰہُ الباطلَ ویحقّ الحقّ بکلمٰتہٖ اِنّہٗ علیمٌ بذاتِ الصدور (شوریٰ) کیا وہ کہتے ہیں کہ محمد نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے اگر اللہ چاہتا تو وہ آپ کے دل پر مُہر لگا دیتا اللہ باطل کو مٹاتا اور حق کو اپنے کلمات سے ثابت کرتا ہے بے شبہ وہ دلوں کے اسرار سے خوب واقف ہے۔

(۶) کوئی شبہ نہیں کہ آپ دیانتدار اور سچے قاصد ہیں اللہ کی وحی بعینہٖ لوگوں تک پہونچا دیتے ہیں

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ [۱] (الحاقہ)   کوئی شبہ نہیں کہ قرآن رسول کریم کا قول ہے۔

(۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھانا اور اس کو آپ کے سینۂ اقدس و اطہر میں محفوظ رکھنا، یہ سب اللہ کے ذمہ ہے۔ اس بنا پر آپ سے اس کے یاد کرنے اور سمجھنے میں نہ کوئی غلطی ہو سکتی ہے۔ اور نہ آپ کو اس میں کوئی سہو پیش آ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سید کونین فداہ ابی و امی اس خیال سے کہ کہیں وحی الٰہی کا کوئی لفظ گوشۂ یاد سے اوجھل نہ ہو جائے نزول وحی کے وقت اپنی زبان حق ترجمان کو جلدی جلدی حرکت دیتے تھے، تو خدا نے ایسا کرنے سے منع فرما دیا ارشاد ہے۔

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ	آپ جلدی جلدی پڑھنے کے لئے اپنی زبان کو
عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ	حرکت نہ دیجئے قرآن کا آپ کے سینہ میں جمع
فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ [۲]	کرنا اور اس کا پڑھانا تو ہمارا ذمہ ہے۔ جب ہم

[illegible]

[۱] جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے سورۂ تکویر میں "رسول کریم" سے مراد جبرئیل ہیں لیکن سورہ الحاقہ میں رسول کریم سے مراد آنحضرت ہیں۔ دونوں سورتوں میں "رسول کریم" کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ آنحضرت اور جبرئیل دونوں کو رسول اس لئے کہا گیا ہے کہ جبرئیل اللہ اور آنحضرت صلعم کے اور سرور دو عالم اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان نامہ بری اور رسالت کا فرض انجام دیتے ہیں اور چونکہ دونوں اپنے اپنے وظیفۂ منصبی کے ادا کرنے میں نہایت دیانتدار اور امین ہیں۔ اس لئے دونوں "رسول کریم" ہیں۔ کسی شخص کو قول کے لفظ سے اشتباہ نہ ہونا چاہئے کہ اس کی اضافت رسول کی طرف ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ قاصد کا قول اگرچہ اس کی زبان سے ادا ہوتا ہے اور اس لئے اس کا قول (مجازاً) کہلاتا ہے۔ لیکن دراصل وہ ہوتا ہے کلام اس شخص کا جس کا نامہ بر یہ قاصد ہوتا ہے۔

[۲] کور چشمان باطن اگر آفتاب حقیقت کی ایک ہلکی سی کرن بھی دیکھ سکیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ قرآن مجید کے وحی الٰہی ہونے کے تمام دلائل ایک طرف اور صرف "لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ" ایک طرف، یہ مختصر سی آیت اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ قرآن حضور کا اپنا کلام نہیں، کون نہیں جانتا کہ کوئی متکلم کلام کرتے وقت اپنی زبان کو اس لئے جلد جلد حرکت نہیں دیتا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اسے یاد رہ جائے (بقیہ حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ پر)

ایک آیت میں ہے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى ۝ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى (الاعلیٰ)

ہم آپکو پڑھائیں گے، پھر آپ نہ بھولیں گے مگر وہ جسے اللہ ہی چاہے۔ وہ کھلی اور چھپی باتوں کو جانتا ہے اور ہم آہستہ آہستہ آپ کو آسانی تک پہونچائیں گے۔

(۸) صرف پڑھانا اور یاد کرانا ہی نہیں بلکہ اُس کی تشریح و توضیح بھی اللہ ہی کے ذمہ ہے

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (القیمۃ) پھر اس کو سمجھانا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بسلسلہ وحی جتنے امور بحث طلب ہو سکتے تھے دیکھو قرآن مجید نے کس طرح ان میں سے ایک ایک امر کے بارہ میں واضح تصریحات کی ہیں۔

قرآن آپ کے قلب پر نازل ہوا ساتھ ہی اس نے نزول قرآن کی کیفیت بھی بیان کی ہے کہ اس کا تعلق حواسِ ظاہری سے نہیں بلکہ دل سے ہے۔ ارشاد ہے۔

فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ جبریل نے قرآن کو اللہ کے حکم سے آپکے دل پر اتارا ہے

ایک اور مقام پر ہے۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ

قرآن کو روح الامین آپ کے قلب پر لیکر نازل ہوئے ہیں تاکہ آپ ڈرانیوالوں میں سے ہوں

لوح محفوظ کا بیان ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مطہر پر نازل ہونے سے پہلے لوحِ محفوظ میں موجود تھا۔ ارشاد ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) یقینی بات ہے کہ حضور پر مبدا رفیاض کی جانب سے قرآن مجید کا فیضان ہو رہا تھا اور آپ بہ تقاضا بشریت اُسے یاد کرنے کیلئے اپنی زبان کو جلد جلد حرکت دیتے رہتے تھے اس پر حضرت حق جل مجدہٗ نے یہ آیت نازل فرمائی

بل ھُوَ قرآن مجیدٌ فی لوحٍ محفوظ — بلکہ وہ قرآن مجید ہے جو لوح محفوظ میں ہے۔
(البروج)

اور صرف قرآن مجید ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام واقعات و اشیاء کا تذکرہ اُس میں موجود اور ثبت ہے۔ فرمایا گیا ہے۔

کُلَّ شیٔ احصینٰہ فی امامٍ مُبینٍ (یٰس) — ہم نے تمام باتوں کو ایک واضح کتاب میں جمع کر دیا ہے۔

ایک آیت میں لوح محفوظ کو "کتاب مُبین" کہا گیا ہے اور اُس میں بھی اس کی اسی صفت کا بیان ہے۔

وعِندَہٗ مفاتحُ الغیب لا یعلمھا اِلّا	اور اللہ کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو صرف
ھُوَ و یَعلمُ ما فی البَرّ والبحرِ وَمَا	اللہ ہی جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اُن
تسقطُ مِن وَرَقَۃٍ اِلّا یَعلمُھا ولا	چیزوں کو جو خشکی میں اور سمندر میں ہیں اور جو پتہ
حَبّۃٍ فی ظلمات الارض ولا رطبٍ	گرتا ہے اور زمین کی تاریکیوں میں جو دانہ گرتا
ولا یابس الا فی کتابٍ مُبینٍ	ہے اللہ تعالیٰ ہی اُس کو جانتا ہے اور کوئی
(انعام)	تر اور کوئی خشک چیز ایسی نہیں ہے جو کھلی
	ہوئی اور واضح کتاب میں نہ ہو۔

سورۂ حدید میں ارشاد ہوتا ہے۔

مَا اصابَ مِن مصیبۃٍ فی الارضِ	ملک میں یا خود تمہارے اندر جو مصائب نازل
ولا فی انفسکم الّا فی کتابٍ مِن	ہوئے ہیں اُن میں کوئی مصیبت ایسی نہیں
قبلِ ان نبراءھا اِنَّ ذالک	ہے جو اُس کو پیدا کرنے سے پہلے لوح محفوظ
علَی اللہ یَسیر	میں محفوظ نہ ہو۔ یہ بے شبہ اللہ کے لئے آسان ہے

سورۂ القمر میں اُس کا بیان اس طرح ہے۔

وَکُلُّ شَیْءٍ فَعَلُوْہُ فِی الزُّبُرِ وَکُلُّ صَغِیْرٍ وَکَبِیْرٍ مُّسْتَطَرٌ — اور ہر وہ چیز جو انھوں نے کی لکھی ہوئی ہے دفتروں میں اور ہر چھوٹی بڑی چیز لکھی جا چکی

ان آیات کی روشنی میں قرآن مجید سے لوح محفوظ کی نسبت صرف اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز ہے جس میں بدو آفرینش سے انتہا تک کے تمام حالات و واقعات، اوامر و نواہی، اور رموز و اسرار لکھے ہوئے ہیں اور اُن کے ساتھ قرآن بھی اُس میں لکھا ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں اتنی بات کا اور اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن میں آلات کتابت و تحریر میں سے قلم کا بھی ذکر ہے ارشاد ہے

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ — ن، قسم ہے قلم کی اور اُس کی جس سے لکھتے ہیں

لیکن اس لوح کی شکل و صورت کیسی ہے؟ اور اُس کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن نے حسب دستور عرش و کرسی کی طرح اس کی بھی کوئی حقیقت بیان نہیں کی۔ البتہ بعض کتب احادیث میں اس کے متعلق حضرت ابن عباس کا ایک اثر ملتا ہے لیکن اُس سے بھی کوئی حقیقت متعین نہیں ہوتی بعض لوگوں نے کہا ہے کہ لوحِ محفوظ ایک جوہر مجرد ہے کسی چیز میں نہیں اور وہ صور علمیہ کے لئے بمنزلہ آئینہ کے ہے لیکن کتاب و سنت کے ظواہر الفاظ سے اس کی بیّن تائید نہیں ہوتی۔ بطور تمثیل یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح حافظ قرآن کے دماغ میں قرآن مجید کے کلمات ثبت ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اس میں منقوش و مکتوب نہیں ہوتے۔ اسی طرح لوح محفوظ میں تمام عالم کے مقادیر ثبت ہیں لیکن عالم الواح دنیا پر قیاس کر کے اُن کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں کہ اُس میں مقادیر منقوش ہیں۔ واللہ اعلم

قرآن کو کلام اللہ بھی کہا گیا ہے | پھر قرآن مجید کو صرف وحی کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اُسے صاف لفظوں میں کلام اللہ بھی کہا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ — اور اگر کوئی مشرک آپ سے امن طلب کرے تو

فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ — آپ اُسکو امن دیدیجئے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سُنے۔

قولِ بشر کہنے پر عذاب دوزخ کی وعید

اب چونکہ حضرت جبرئیل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توثیق کر کے قرآن کے وحی اور منزل من اللہ ہونیکے ثبوت میں اللہ کی طرف سے حجت تمام ہوچکی ہے۔ اس لئے اب کسی منکر کا عذر لائق پذیرائی نہیں ہو سکتا۔ اور جو شخص اب بھی قرآن کو کلام بشر، یا جادو کہتا ہے وہ بے شبہ دوزخ کے عذاب کا سزاوار ہے۔ ایک مرتبہ ولید بن مغیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے قرآن پڑھ کر سنایا وہ کسی قدر اُس سے متاثر ہوا۔ مگر ابوجہل اور دوسرے سرداران قریش نے اُس کو ورغلایا۔ اور پوچھا "قرآن کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے" کہنے لگا "ذرا سوچ لوں" آخر تیوری بدل کر اور منہ بنا کر بولا "یہ تو بابل کا جادو ہے جو نقل ہوتا چلا آتا ہے" اور "یہ تو انسان کا قول ہے" اس پر قرآن مجید میں آیت ذیل اتری جس میں عذاب دوزخ کی وعید کی گئی ہے۔

اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ	اُس نے سوچا اور دل میں ایک بات ٹھرالی، وہ
ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ثُمَّ نَظَرَ ثُمَّ	مارا ہی جائے اُس نے دل میں کیا بات ٹھرائی
عَبَسَ وَبَسَرَ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ	تھی۔ پھر وہ مارا ہی جائے اُس نے کیا ٹھرایا تھا
فَقَالَ اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ	پھر اُس نے دیکھا۔ تیوری چڑھائی اور منہ پھلالیا
اِنْ هٰذَا اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ	پھر پشت پھیرلی اور غرور کیا اور کہنے لگا "یہ
	تو جادو ہے جو منقول ہوکر آتا ہے۔ یہ تو قولِ
	بشر ہی ہے۔

یہاں تک تو ولید بن مغیرہ کا مقولہ اور اُس کے احوال و کوائف کا بیان تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے۔

سَاُصْلِيهِ سَقَرَ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا سَقَرُ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿المدثر﴾

اب اُس کو میں دوزخ میں ڈالونگا اور آپ کیا سمجھے کہ کیسی ہے وہ دوزخ، وہ نہ کچھ باقی رکھتی ہے اور نہ چھوڑتی ہے وہ آدمیوں کو جھلسا دینے والی ہے

قرآن مع عربی الفاظ کے وحی الہیٰ ہے | اب صرف ایک مسئلہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن جس کو اللہ کا کلام کہا گیا ہے۔ وہ صرف معانی و مطالب کے لحاظ سے ہے۔ یا عربی الفاظ اور اُن کی مخصوص نشست و ترکیب کے لحاظ سے بھی۔ آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ یہ لفظ و معنیٰ کی تفریق خاص عہد نبوت میں اُن لوگوں نے بھی نہیں کی جو رسول صادق و امین کی تکذیب کیلئے ایک ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈھتے تھے وہ خود ارباب لسان تھے۔ زبان کی فصاحت و بلاغت اور اسالیب بیان کی مہارت میں یگانۂ روز گار تھے۔ اس کے باوجود قرآنی الفاظ کے اعجاز نے انھیں اس درجہ متاثر کردیا تھا کہ وہ پورے قرآن کو تو مع اُس کے الفاظ و معانی کے "ساحرانہ" "کاہنانہ" یا "شاعرانہ" کلام کہتے تھے۔ لیکن یہ کہنے کی ہمت انھیں بھی نہیں ہوئی کہ "محمد (صلعم) کے الفاظ میں ایسی کونسی الوہی خصوصیت ہے کہ وہ انھیں بھی اللہ کا نازل کیا ہوا کہتے ہیں۔ ایسے جملے اور ایسی عبارتیں تو ہم بھی بول اور لکھ سکتے ہیں۔

لیکن خدائے علام الغیوب کو علم تھا کہ اب نہیں تو بعد میں تفلسف اور عقلیت پرستی کے دور میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو ایک طرف اپنے مسلمان ہونے کا ادعا کرینگے اور دوسری طرف اپنے تفلسف کا بھرم قائم رکھنے کے لئے قرآن کو معانی و مطالب کے لحاظ سے تو وحی خداوندی تسلیم کرینگے لیکن اُس کے الفاظ کی نسبت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے میں متامل نہیں ہونگے اس بناپر قرآن مجید نے اس مسئلہ کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا۔ اور اس کی بھی تصریح کردی کہ قرآن مع الفاظ عربی کے اللہ کا کلام ہے اور اللہ کی طرف سے وحی کا نزول انھیں عربی الفاظ میں ہوا ہے

ارشاد ہے۔

قرآناً عربیاً غیر ذی عوج	قرآن عربی بغیر کسی کجی کے

علاوہ ازیں آیات ذیل غور سے پڑھئے۔

إنّا انزلناہ قرآناً عربیاً	ہم نے قرآن عربی نازل کیا ہے
انّا جعلناہ قرآناً عربیاً لعلّکم	بے شبہ ہم نے اس کو عربی قرآن بنایا ہے
تعقلون	تاکہ تم سمجھو۔
وکذالک انزلناہ قرآناً عربیاً	اور اسی طرح ہمنے اسکو قرآن عربی بنا کر اتارا ہے
وکذالک انزلناہ حکماً عربیاً	اور اسی طرح ہمنے اسکو عربی قرآن بنا کر اتارا ہے

دیکھئے! ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مطلق قرآن کے نزول کی نسبت اپنی طرف نہیں کی بلکہ اس قرآن کی نسبت اپنی طرف کی ہے جو عربی زبان میں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہونا بھی یہی چاہئے تھا کیونکہ محض معانی و مطالب کے القاء و ایجاء کے کوئی معنی ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ جس طرح معانی کا زبان سے اظہار بغیر الفاظ کے نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح معانی کا دل میں خطور اور اُن کا تعین بھی الفاظ کے بغیر ناممکن ہے۔

تنقیحات و نتائج | اب ان سب آیات کو سامنے رکھ کر غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح قرآن مجید کی نسبت ایک ایک بات کو کھول کر بیان کیا ہے اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ اس میں رمز بھی ہے کہ لوگوں کو قرآن مجید کے وحی الٰہی ہونے میں کوئی شک اور تردد نہ رہے۔ یہی مسئلہ دین کی اساس اور بنیاد ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ اس پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا۔ ان تمام آیات سے حسب ذیل نتائج ثابت ہوتے ہیں۔

(۱) قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ اور مع الفاظ و معانی کے۔

(۲) حضرت جبریل اُسے لیکر نازل ہوئے ہیں۔
(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ نازل ہوا ہے۔
(۴) جبریل اور آنحضرت دونوں بے انتہا امین اور دیانتدار ہیں۔
(۵) آنحضرت نے یا کسی اور شخص نے اُس کو بنایا نہیں ہے۔
(۶) شیاطین نے اُس کا انقا نہیں کیا۔
(۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رسول کریم تھے۔ قرآن آپ پر جیسا نازل ہوتا تھا ویسا ہی لوگوں تک پہونچا دیتے تھے۔ آپ کو اس میں نہ نسیان ہوسکتا تھا اور نہ کوئی مغالطہ۔
(۸) آپ شاعر، کاہن، یا ساحران میں سے کچھ نہ تھے۔
(۹) قرآن کے منزل من اللہ ہونے کے دلائل قاطع کا بیان
(۱۰) اس پر کفار و مشرکین کے اعتراضات وسواس کا حتمی رد۔
(۱۱) عام انسانوں تک اللہ کے اس کلام کے پہونچنے کا ذریعہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ اور آپ چونکہ ہر طرح اللہ کے معتمد اور اُس کے سچے رسول ہیں اس لئے جو کلام آپ کی وساطت سے پہونچا ہے اور خود آنحضرت نے بھی اسے خدا کا کلام کہا ہے، ہر انسان کا فرض ہو کہ بے چون وچرا اسے قبول کرلے اور اس کے کلام اللہ ہونے پر ایمان لے آئے۔

مندرجہ بالا نتائج قرآن مجید کے اشارۃ النص یا دلالۃ النص سے نہیں بلکہ ظواہر نصوص سے واضح طور پر برآمد ہوتے ہیں اور اس بنا پر جس طرح کوئی شخص اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول نہ مانے اسی طرح ایسے شخص کا ادعاءِ اسلام صحیح نہیں ہے جو مندرجہ بالا تنقیحات پر ایمان واعتقاد نہ رکھے۔ جمہور امت کا ہر قرن اور ہر زمانہ میں اس پر اتفاق رہا ہے۔ اور جس کسی نے اس کا خلاف کیا اُسے مرتد قرار دیکر گردن زدنی قرار دیا گیا ہے

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں ،، سلف ان لوگوں کو جہمی کہتے تھے جو صفات کی نفی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ قرآن مخلوق ہے اور یہ کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رویت نہیں ہوگی ، کیونکہ جہم سب سے پہلا شخص ہے جس نے نفی اسماء وصفات کی بدعت جاری کی اور اس میں انتہائی غلو اور انہماک سے کام لے کر بار بار اس کی دعوت دی جعد بن درہم نے بھی مسلمانوں کو اس فتنۂ عظیم میں مبتلا کرنا چاہا تو خالد بن عبداللہ القسری نے جو عراق کا گورنر تھا عین بقرعید کے دن جعد کو ذبح کردیا اور ذبح کرتے وقت یہ الفاظ کہے ،، لوگو! تم اپنی اپنی قربانیاں کرو ، اللہ تمہاری قربانیاں قبول فرمائے ۔ میں جعد بن درہم کو قربان کرتا ہوں ۔ یہ شخص اللہ تعالیٰ کی صفات کی نفی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ نے حضرت ابراہیم کو اپنا دوست نہیں بنایا تھا ۔ اور اس نے حضرت موسیٰ سے کلام بھی نہیں کیا تھا ، اللہ ان تمام چیزوں سے بلند و بالا ہے[1]

پس جہاں تک اسلامی عقائد کا تعلق ہے ، ہر اس شخص کے لئے جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے ناگزیر ہے کہ وہ قرآن مجید کو مع الفاظ و معانی کے اللہ کا کلام مانے اور دل سے اس کا اعتقاد جازم رکھے ۔ دنیا بھر کے تمام جزئی اختلافات کے باوجود ۔ یہی اعتقاد ایک ایسا رشتۂ اتحاد ہے جو دنیا کے تمام مسلمانوں کے درمیان ہر قرن اور ہر زمانہ میں قائم رہا ہے ۔ اگر کوئی مدعی اسلام آج اس اعتقاد پر قائم نہیں ہے تو جس طرح زمانہ سلف میں ایسے گمراہ لوگوں کو مسلمانوں کی برادری سے خارج کردیا گیا تھا ۔ یہ شخص بھی ہمارے اسی سلوک کا مستحق ہونا چاہئے ،،

---

[1] رسالہ صفۃ الکلام مطبع منیری مصر ص ۳۳

خدا کی صفاتِ ذاتیہ پر ایک عام بحث

موجودات کی تین قسمیں ہیں (۱) وہ ذوات جن کا وجود خارج میں متحقق ہے (۲) افعال جو ذوات سے صادر ہوتے اور مفعولات میں پائے جاتے ہیں (۳) صفات جو ذوات کے حالات ہوتی ہیں۔ وجود کے اعتبار سے ان تینوں میں فرق یہ ہے کہ ذوات کا وجود خود ان کے ساتھ قائم ہوتا ہے یعنی ان کا وجود اضافی نہیں بلکہ حقیقی ہوتا ہے اس کے برعکس افعال کا وجود فاعل کے وجود پر موقوف ہوتا ہے۔ ورنہ فی حد ذاتہ ان کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اب رہے صفات تو انکی حقیقت یہ ہے کہ یہ اُن حالتوں یا کیفیتوں کا نام ہے جو ذوات میں پائی جاتی ہیں اور صفات کا وجود ذوات میں، اُن کے ساتھ ساتھ، اور اُن کی وجہ سے ہی ہوتا ہے۔ افعال میں اور صفات میں فرق یہی ہے کہ صفات کا قیام ذات کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور افعال کا صدور اگرچہ فاعل سے ہوتا ہے لیکن اُن کا قیام و بقا فاعل کی ذات کے ساتھ نہیں ہوتا۔ پہلی قسم کی مثال انسان ہے۔ دوسری قسم کی مثال حرکت، اور تیسری نوع کی مثال حیار، سخاوت، اور شجاعت وغیرہ ہے۔

یہ مسلم ہے کہ کوئی موجود بھی، خواہ وہ ذات ہو یا صفت ہو یا فعل ہو اس کا وجود بہر حال از خود نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مصدر و منبع ذات واجب الوجود ہے۔ پھر یہ بھی مسلم ہے کہ موجوداتِ ثلاثہ میں اولاً وجود ذوات کا ہوتا ہے پھر صفات کا اور ان کے بعد افعال وجود پذیر ہوتے ہیں۔ اب اس پر اس ایک مقدمہ کا اور اضافہ کیجئے کہ صفات و حالات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو اشیاء کے لئے بذاتہا پائے جاتے ہیں یعنی کسی شئے کا وہ شئے ہونا ہی ان صفات کے وجود کی سب سے بڑی

دلیل ہوتا ہے اور اس کے لئے کسی اور علت موجبہ کی احتیاج نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ دوسری قسم کی صفات وہ ہیں جن کے وجود کے لئے محض کسی شے کا شے ہونا کافی نہیں ہوتا، بلکہ اُن کا وجود کسی علت وسبب موجب کا محتاج ہوتا ہے۔ پہلی قسم کی مثال یہ ہے کہ جیسے گرمی آگ کے لئے اور ٹھنڈک برف کے لئے۔ ظاہر ہے کہ محض آگ کا آگ ہونا، اور برف کا برف ہونا وجودِ حرارت و برودت کے لئے کافی ہے۔ اُس کے لئے کسی علت خارجی کی ضرورت نہیں، یا مثلاً یہ کہ ہر مثلث کے تین زاویے اُس کے دو قائموں کے برابر ہوتے ہیں یہ بالکل صاف ظاہر ہے کہ محض مثلث کا مثلث ہونا یعنی اُس کی ہُوِیّت ہی اس کی اس صفت کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اُس کے تینوں زاویا دونوں قائموں کے برابر ہیں۔

دوسری قسم کی صفات کی مثال یہ ہے کہ جیسے آگ کے قریب ہونے کی وجہ سے پانی میں حرارت کا یا برف ڈلنے سے اس میں برودت کا پیدا ہو جانا جو صفات کسی شے کے لیے لذاتہ ہوتی ہیں، ان کو طبیعت اور خاصیت کہا جاتا ہے۔ ان صفات کے حصول فی الذات کے لیے نفس ذات کے سوا نہ کوئی سبب خارجی ہوتا ہے اور نہ کوئی اور صفت ہی اس کے لیے سبب بنتی ہے، افعال کا ذوات سے جو صدور ہوتا ہے وہ انھیں طبائع اور خواص کے مطابق ہوتا ہے جو ذات کے لیے صفات اولیہ و ذاتیہ کہلاتے ہیں۔

اس تمہید سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ کسی شے کے لیے جو صفات ذاتیہ ہوں گی وہ اُس ذات کے ساتھ ساتھ پائی جائیں گی۔ خواہ اُن صفات کا اس ذات سے صدور ہوا ہو یا نہ ہو۔ مثلاً جو شخص سخی ہے۔ جب تک وہ موجود ہے سخی کہلائے گا، یا جو شخص بہادر ہے۔ بہر حال وہ بہادر ہے۔ خواہ اس سے اب تک شجاعت اور سخاوت کا عملاً صدور نہ ہوا ہو۔ کیونکہ سخی اور شجاع ہونے کے معنی یہ ہیں کہ سخاوت اور شجاعت کے موقع پر یہ شخص سخاوت اور شجاعت کے جوہر دکھائے گا تو ہمارا یہ کہنا خود اس بات کی

دلیل ہے کہ ہم نے صدورِ فعل سے پہلے ہی اُس کو وصفِ شجاعت وسخاوت کے ساتھ متصف مان لیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب تک کسی شخص سے ملکۂ سخاوت وشجاعت کا عملی اظہار وصدور نہ ہوگا۔ ہم اُس کو کس طرح سخی یا شجاع کہہ سکتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ کسی شے کے متعلق ہمارا عدمِ علم اُس شے کے عدم کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ نے کسی فصیح وبلیغ مقرر وخطیب کی تقریر دلپذیر اب تک نہیں سُنی ہے تو یہ کس طرح اس بات کی دلیل بن سکتا ہے کہ وہ مقرر وخطیب سرے سے فصیح وبلیغ ہی نہیں ہے۔ اس سے یہ نتیجہ صاف طور پر نکل آتا ہے کہ خدا میں جو صفات پائی جاتی ہیں۔ اسکے وجود کیلئے تخلیق عالم کی ضرورت نہیں ہے۔ اُس میں صفتِ خلق ورزق کا پایا جانا اس کا علیم ہونا متکلم ہونا اور اُس کا صفت سمع وبصر سے متصف ہونا اسپر موقوف نہیں ہے کہ اُس کے بالمقابل کوئی شے مرزوق اور مخلوق وغیرہ بھی پائی جائے بلکہ وہ اپنی تمام صفات کمالیہ سے علیٰ وجہ التمام والکمال اُس وقت بھی متصف تھا جبکہ صرف وہ ہی وہ تھا اور اُس کے علاوہ تمام چیزیں "ولم یک شیاءً مذکوراً" کے حجابِ غلیظ میں مستور تھیں۔

اب رہی یہ بات کہ خدا میں کون کون سی صفات پائی جاتی ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم جس ذاتِ گرامی کو خدا کہتے ہیں وہ تمام صفات کمالیہ کی متجمع ہے اور اس کی واضح ترین دلیل یہ ہے کہ جس طرح ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے متنبی کا مشہور مصرعہ ہے

وبضدھا تتبین الاشیاء

اسی طرح کسی چیز کا ناقص ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے بالمقابل کوئی اور کامل چیز پائی جارہی ہے۔ پھر یہ ظاہر ہے کہ کمال اور نقص دو قسم کے ہوتے ہیں ایک حقیقی اور دوسرا اضافی۔ کمال حقیقی سے مراد یہ ہے کہ وہ سرتاپا کمال ہی کمال ہو اور اُس میں ادنیٰ سا شائبہ نقص بھی نہ پایا جائے اسی طرح نقص حقیقی کے معنی یہ ہیں کہ وہ سربسر ناقص وغیر مکمل ہو اور اُس میں کمال کی ہلکی سی آمیزش

بھی نہ ہو ان دونوں کے درمیان نقص و کمال اضافی کا وجود ہوتا ہے جس کے مراتب بیشمار نکلتے ہیں۔ پس جس طرح ہمارا وجودِ ناقص ایک کامل اور ابدی و ازلی وجود کا پتہ دے رہا ہے اسی طرح ہماری صفاتِ کمال کا نامکمل و ناقص ہونا اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ بالیقین کوئی ذاتِ گرامی ایسی موجود ہے جس میں یہ تمام صفات کمال کے مرتبۂ قصوٰی کے ساتھ پائی جائیں اور اس میں کیا شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ ذات بجز اُس کے کوئی اور نہیں ہے جو سرچشمۂ وجود اور مبدأ فیاض عالم ہے

خدا کے لیے اثبات صفات کمالیہ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ انسان میں جو صفاتِ کمالیہ پائی جاتی ہیں وہ ظاہر ہے کہ انسان کے لیے اصلی اور ذاتی نہیں ہیں اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جو شے اصلی اور ذاتی نہیں ہوتی وہ کسی غیر کی معلول ہوتی ہے۔ اس بنا پر لامحالہ ہماری تمام صفاتِ کمال کسی غیر کا معلول ہونگی اور آخر کار یہ سلسلہ کسی ایسی ذات پر منتہی ہوگا جو تمام اشیاء کی علت تامہ و مطلقہ ہے اور خود وہ کسی کا معلول نہیں۔ ورنہ پھر دور یا تسلسل لازم آئے گا اور چونکہ ذاتِ گرامی صفتِ وجود میں اکمل ہے۔ اس لئے اُس کی ہر ہر صفتِ کمال بھی ایسی ہی اکمل ہوگی۔

اب مذکورہ بالا تقریر کو اوّل سے آخر تک پھر ایک مرتبہ غور و خوض سے پڑھئے تو یہ نتیجہ بالکل بدیہی طور پر نکل آتا ہے کہ

(۱) خدا کی ذات مستجمع ہے تمام صفاتِ کمالیہ کو

(۲) یہ تمام صفات اُس کی ذات کے ساتھ قائم اور ازلی و ابدی ہیں۔

صفات کی حقیقت | ہم خدا کی صفات کی نسبت صرف اتنا ہی جان سکتے ہیں اور جاننا چاہیے۔ اس سے متجاوز ہو کر اگر آپ یہ پوچھیں کہ ان صفات کی حقیقت کیا ہے؟ اور اُن کا قیام ذاتِ باری کے ساتھ کس نوعیت کا ہے؟ تو ہم اس کے جواب میں صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ہم صفاتِ باری کو اپنی صفات پر قیاس نہیں کرسکتے؛ یعنی ہم جس طرح یہ کہتے ہیں کہ ہمارے لیے بھی وجود ہے

اور خدا کے لیے بھی، لیکن با ایں ہمہ ہم پورے وثوق اور یقین سے جانتے ہیں کہ خدا کا وجود ہمارے وجود کی طرح نہیں ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم کو یقین رکھنا چاہیئے کہ خدا پر اور ہم پر صفاتِ کمال کے لفظی اطلاق کے باوجود ہماری ان صفات کو خدا کی صفات پر کسی طرح قیاس نہیں کیا جا سکتا، مثلاً یوں سمجھئے کہ خدا کو رحمٰن اور قہار کہا جاتا ہے اور وہ بے شبہ ان صفات کے ساتھ بدرجۂ اتم موصوف ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اس کا رحم اور قہر ہمارے رحم اور قہر کے مانند نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ رحم اور قہر کے مفہوم میں تاثر و انفعال داخل ہیں، یعنی ہم کسی پر رحم کرتے ہیں تو یہ نتیجہ ہوتا ہے ہمارے نفس کی رقت کا جو کسی قابل رحم چیز کو دیکھ کر ہمارے اوپر طاری ہو جاتی ہے اسی طرح قہر ہمارے نفس کے ہیجان و ثوران کا ثمرہ ہوتا ہے جو کسی ناگوارِ طبع چیز کے دیکھنے سے ہمارے احساس و شعور پر مستولی ہو کر قوتِ غضبی کو برانگیختہ کر دیتا ہے

اب یہ ظاہر ہے کہ رحم اور قہر دونوں کی تعریف میں مبدا اور غایت کے لحاظ سے دو چیزیں شامل ہیں۔ مبدا کے مرتبہ میں انفعال و تاثر ہے اور غایت کے درجہ میں فعل و تاثیر۔ اور چونکہ خدا کی ذات انفعال و تاثر سے منزہ ہے اس لئے اس کا رحمٰن و قہار ہونا صرف غایت کے لحاظ سے ہے مبدا کے اعتبار سے نہیں۔ یہ ایک ایسی واضح بات ہے کہ کسی سلیم الطبع انسان کو نہ اس سے انکار ہو سکتا ہے اور نہ کوئی شک و شبہ، اسی پر خدا کی دوسری صفات مثلاً علم، ارادہ، مشیت قدرت اور کلام کو قیاس کر لیجئے۔ ان کمالات کا اطلاق جن معانی سے ممکنات پر ہوتا ہے خدا پر نہیں ہو سکتا۔

اب اس امر کو تسلیم کرنے میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم خدا کی صفات کی نسبت صرف اتنا ہی جان سکتے ہیں کہ خدا میں یہ صفات پائی جاتی ہیں۔

دور بینانِ بارگاہِ الست ۔۔۔ غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

باقی رہا یہ سوال کہ کیونکر؟ اور کس طرح؟ تو ہم اس کی نسبت کچھ نہیں بتا سکتے۔ کیونکہ کوئی چیز

ایسی موجود نہیں ہے جس پر ہم خدا کی ذات و صفات کو قیاس کر سکیں۔ اس کے لیے نہ کوئی ند (مثل) ہے اور نہ ضد۔ اس نے خود فرمایا ہے "لیس کمثلہ شئی"۔ اکبر الہ آبادی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے۔

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا　　　بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے

پھر ذرا اس پر بھی غور کیجیے کہ خدا کی ذات و صفات کا کیا ذکر! خود ہمارے اندر کتنی باطنی قوتیں اور ملکات ہیں جن کو ہم ان کے آثار سے پہچانتے ہی نہیں بلکہ ان کے وجود کا یقین رکھتے ہیں، اور اس کے باوجود ہم ان کی حقیقت و ماہیت سے بے خبر ہیں۔ خود علم کو لیجیے، بچہ بچہ اور جاہل سے جاہل انسان بھی علم کی فضیلت اور برتری کا معترف ہے۔ لیکن علم انسانی کی حقیقت کیا ہے؟ وہ صورۃ حاصلہ فی العقل ہے؟ یا حصولِ صورت کا نام علم ہے؟ یا خود قوت مدرکہ کو علم کہتے ہیں؟ یا عالم اور معلوم کے درمیان جو نسبتِ رابطہ ہے وہ علم ہے؟ علم کے سلسلہ میں یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں جن کا قطعی اور حتمی جواب آج تک نہیں دیا جا سکا۔ نفس ناطقہ انسانی کو سب یہ کہتے ہیں کہ وہ مبدأ ادراک ہے کلیات و جزئیات کے لیے عقل کو دنیا جانتی ہے کہ وہ انسان کے لیے سب سے بڑا طغرائے شرف و امتیاز ہے۔ روح کے متعلق کس کو خبر نہیں کہ زندگی کا دارومدار اس کے اتصال بالجسم پر موقوف ہے لیکن جب سوال کیا جاتا ہے کہ نفس ناطقہ کیا ہے؟ عقل کی حقیقت و ماہیت کیا ہے؟ روح کی حدتام کیا ہے؟ تو ان سوالات کے جواب میں فلاسفہ کے نظریات اس درجہ مختلف نظر آتے ہیں کہ ان کی روشنی میں کسی ایک قطعی نتیجہ تک پہونچنا دشوار بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ پس جب ان چیزوں کی نسبت ہمارا علم اس قدر محدود ہے تو پھر ظاہر ہے کہ خدا کی ذات و صفات کے بارہ میں ہماری رسائی کہاں تک ہو سکتی ہے کسی نے سچ کہا ہے۔

تو بر اوج فلک چہ دانی چیست　　　چوں ندانی کہ در سرائے تو کیست

صفت ذات اور صفت فعل | آپ پڑھ آئے ہیں کہ صفات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک صفات ذاتیہ

جو ذات کے ساتھ قائم ہوتی ہیں۔ اور دوسری وہ جو ذات کے ساتھ قائم نہیں ہوتیں۔ خدا کی صفات بھی دو قسم کی ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ اُن کو صفتِ ذات اور صفتِ فعل سے تعبیر کرتے ہیں۔ خدا کی صفاتِ ذاتیہ کا تعلق اُس کی ذات کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسے پھول کے ساتھ رنگ و بو۔ آفتاب کے ساتھ حرارت اور روشنی۔ پانی کے ساتھ برودت۔ اور آگ کے ساتھ گرمی کا تعلق و قیام ہے۔ رہی صفتِ فعل تو یہ وہ صفت ہے جو کسی معلول یا مفعول کے ساتھ تعلق کی وجہ سے خدا کے لئے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً آگ کی ایک تو صفتِ حرارت ہے جو اُس کے لیے ذاتی ہے۔ جب آگ کا وجود ہوگا حرارت ضرور پائی جائے گی اور ایک صفت ہے جلانا، تو ظاہر ہے کہ یہ صفت اُس رابطہ پر دلالت کرتی ہے جو آگ کے اور کسی اور چیز کے درمیان پایا جاتا ہے، اس پر ہی خدا کی صفتِ فعل کو قیاس کر لیجئے یعنی یہ صفت کسی خاص فعل کے اعتبار سے اُس تعلق کو ظاہر کرتی ہے جو خدا اور اُس کے بندہ کے درمیان ہوتا ہے۔ اس صفت کی نسبت دو باتیں بالکل واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ صفتِ ذات کی طرح اس صفت کا موصوف بھی ذات ہی ہوگی کیونکہ جس طرح صفتِ ذات کا قیام و تعلق ذات کے ساتھ ہے اسی طرح اس صفت کا مبدا، صدور بھی ذات ہی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ صفتِ فعل، صفتِ ذات کا ہی پر تو ہوتی ہے، لیکن چونکہ یہ صفت اُس تعلق کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے جو کسی دوسری شے کے ساتھ ہوتا ہے، اس لئے اس صفت کو ذاتِ موصوف کے ساتھ وہ تعلق نہیں ہوتا جو صفتِ ذات کو ہوتا ہے۔ اس بنا پر اس صفت کا ظہور جو مختلف اشکال و صور میں ہوتا ہے اُس کا اثر ذات پر کچھ نہیں ہوتا۔ یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ صفت کی وجہ سے ذاتِ موصوف میں کوئی تغیر پیدا ہو گیا ہے۔

تعددِ صفات اور وحدانیتِ ذات

اس تقریر سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ خدا کے لیے متعدد صفات کا پایا جانا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ خود اُس کی ذات میں بھی تعدد یا ترکب پایا جائے۔ کیونکہ

ہم مخلوقات میں دیکھتے ہیں کہ کثافت کے باوجود متعدد اشیاء کے اعتبار سے ایک شے کے لیے ہزاروں صفات والقاب ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک آدمی کسی کا باپ کسی کا بھائی، کسی کا خاوند، کسی کا چچا اور کسی کا بھتیجہ کہلاتا ہے۔ ان تمام مختلف القاب کے باوجود یہ شخص شخصِ واحد ہی رہتا ہے۔ اور اس کے ایک ہونے میں فرق نہیں پڑتا۔ پس جب کثیف چیزوں کا یہ حال ہے تو ظاہر ہے خدا کی صفات کے تعدد سے اس کی ذات میں کس طرح تعدد پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ تو تمام موجودات سے زیادہ لطیف بلکہ سرچشمۂ لطافت ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہ نسبت کثیف کے لطیف میں تعدد و تکثر بہت کم ہوتا ہے اس سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکل آتا ہے کہ وہی ایک ذاتِ خداوندی ہے جو کسی جہت سے خالق کسی وجہ سے رازق اور کسی لحاظ سے متکلم اور کسی اعتبار سے رحمٰن اور قہار و جبار ہے

اسی حقیقت کو ایک اور واضح تر مثال سے سمجھئے! آفتاب کو طلوع کے وقت دیکھئے، کتنا بڑا اور انگاروں کی طرح سرخ اور بے شعاع نظر آتا ہے۔ پھر بلند ہو کر سفید دکھائی دیتا ہے اور مقدار میں چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب غروب ہونے لگتا ہے تو زرد بن جاتا ہے ان سب صورتوں میں یونہی کہتے ہیں کہ آفتاب کو دیکھا۔ اب غور کیجئے! کیا یہ تمام تغیرات ذاتِ آفتاب میں ہوتے ہیں؟ ہرگز نہیں، بلکہ یہ زردی، سرخی، مقدار کا بڑا ہونا، اور چھوٹا ہونا، یہ سب ہماری نظر کے تاثرات وانفعالات ہیں جو آفتاب کے ایک خاص جہت میں نظر آنے اور اس کی شعاعوں کے زمین تک پہونچنے اور ان شعاعوں کے زمین پر عمودی شکل میں یا ترچھے پڑنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ورنہ آفتاب ان تمام حالات میں یکساں رہتا ہے۔ اور اس کی مقدار میں نہ زیادتی ہوتی ہے اور نہ کمی، پس جس طرح آفتاب ایک متعین رنگ رکھنے کے باوصف، مختلف الوان وصور میں جلوہ نما ہوتا ہے اور طرح طرح سے تجلی کرتا ہے۔ ایسے ہی حضرت باری عز اسمہٗ ذاتِ واحد ہے اس میں کسی قسم کا تعدد نہیں، لیکن با ایں ہمہ تجلیاتِ متعددہ رکھتا ہے اور ان تجلیات سے کام صفات

کا نکلتا ہے۔

صفات کا ظہور حوادث میں

اس تقریر سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ خدا کی صفات کا ظہور حوادث کی شکل و صورت میں ہوتا ہی لیکن اس کے باوجود ہم اُن حوادث پر قیاس کرکے صفات کو حادث نہیں کہہ سکتے، وہ بدستور قدیم ہی رہیں گی۔ اور اگرچہ تجلی کی صورت میں صفات کے لئے بظاہر تغیر و تبدل پایا جائے گا۔ لیکن یہ محض نظر کا دھوکا ہوگا۔ ورنہ دراصل وہ غیر متغیر و غیر متبدل ہیں۔ مثال کے لئے ایک ایسی لالٹین کا تصور کیجئے جو ہشت پہلو ہے اُس کے چاروں طرف آٹھ مختلف رنگوں کے شیشے لگے ہوئے ہیں اور ان سب کے اندر ایک چراغ رکھا ہوا ہے اب دیکھئے چراغ کے لئے ایک روشنی تو وہ ہے جو چراغ کی ذات کے ساتھ قائم ہے، یہ روشنی مطلق ہے کسی رنگ یا کسی مقدار کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک روشنی وہ ہے جو رنگین شیشوں کے عکس سے چھن چھن کر مختلف رنگوں کے ساتھ نظر آرہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں روشنیاں چراغ کی ہیں کیونکہ سبز یا سُرخ روشنی کو کوئی نہیں کہتا کہ یہ سبز یا سُرخ شیشہ کی روشنی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ پہلی قسم کی روشنی (مطلق روشنی) ذاتِ چراغ کے ساتھ قائم ہے، کوئی شیشہ نہیں ہوگا۔ تب بھی یہ روشنی پائی جائیگی، لیکن دوسری روشنی کے ظہور و قیام کا تعلق شیشہ کے ساتھ ہے۔ چنانچہ اگر آپ ان آٹھوں شیشوں میں سے کوئی شیشہ لالٹین سے نکال لیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ اُس شیشہ کے رنگ کی روشنی بھی یک بیک غائب ہو جاتی ہے۔ اس مثال میں تین باتیں خاص طور پر لائق توجہ ہیں۔

(۱) جتنے مختلف رنگوں کی روشنیاں نظر آرہی ہیں وہ سب شمع کی ہیں۔

(۲) شمع کی روشنی بذاتِ خود ان رنگوں میں سے کسی خاص رنگ کے ساتھ مقید نہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ شمع کی روشنی کا مختلف رنگوں میں نظر آنا شیشوں کی وجہ سے ہی ہے۔

(۳) رنگ اور روشنی دونوں الگ دو چیزیں ہیں لیکن دونوں میں تعلق یہ ہے کہ روشنی ظاہر

ہے اور رنگ مظہر یا دوسرے لفظوں میں یہ کہیے کہ روشنی متجلی ہے اور رنگ متجلی فیہ۔ اور اس تعلق کے باعث دونوں میں ارتباط اس درجہ شدید ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اس میں خاص طور پر لحاظ کے قابل چیز یہ ہے کہ روشنی کا سرخ یا سبز ہونا شیشہ پر روشنی کا پرتو پڑنے کی وجہ سے ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ روشنی کے لیے بذاتہ کوئی رنگ نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود سرخی یا سبزی کی صفت ثابت ہوتی ہے روشنی کے لیے ہی نہ کہ شیشہ کے لئے۔ کیونکہ یہاں روشنی اور رنگ میں ذاتاً الگ الگ ہونے کے باوجود اس قدر زبردست اختلاط و ارتباط ہے کہ گویا دونوں ایک ہی ہیں اور ان میں سے ایک کا قیام دوسرے کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسا کہ صفتِ ذاتی کا قیام و تعلق موصوف کے ساتھ ... جن سطور پر خط کھینچا ہوا ہے۔ ان کو بار بار پڑھیے اور غور کیجیے تو آپ کو صفاتِ خداوندی کی تجلی اور حوادث کی شکل میں ان کے ظہور پر بڑی بصیرت حاصل ہوگی اور بڑے بڑے خدشات و وساوس کا حل معلوم ہو جائے گا۔

مزید توضیح کی غرض سے ایک اور مثال نقل کرتا ہوں جس سے اصل مسئلہ پر زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ آپ روزانہ دیکھتے ہیں کہ کسی ریڈیو اسٹیشن سے ایک تقریر نشر کی جاتی ہے اور آپ اسے اپنے ریڈیو سیٹ میں سنتے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ریڈیو سیٹ میں ایک پیچ لگا ہوا ہوتا ہے جس کو انگریزی میں والیوم کنٹرول (VolumeControll) کہتے ہیں اور جس سے آواز کو کم یا زیادہ کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اب اس پر غور کیجیے کہ جہاں تک آواز کا تعلق ہے وہ بالکل یکساں ہو یعنی مقرر ایک ہی آواز سے اول سے آخر تک اپنی تقریر کو پڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس میں نہ تیزی پیدا ہوتی ہے اور نہ ہلکاپن لیکن ادھر حال یہ ہے کہ آپ اس پیچ کو دو ایک چکر دیتے ہیں تو آواز ہلکی اور مبہم نکلتی ہے اور اگر اس کو زیادہ گھماتے ہیں تو آواز بلند ہو جاتی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ آواز کا ہلکا ہونا یا تیز ہونا آواز کی ذاتیات میں داخل نہیں ہے اور آپ کے پیچ گھمانے سے مقرر کی اصل

آواز میں کوئی تغیر بھی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ہلکاپن یا تیزی صفت کس کی ہو؟ آواز کی ہی یا کسی اور چیز کی؟ ظاہر ہے کہ آواز ہی کی صفت ہے اور دلیل یہ ہے کہ آپ آواز کے گھٹنے بڑھنے پر بے تکلف بول اُٹھتے ہیں کہ آواز کم ہوگئی یا زیادہ ہوگئی۔

چونکہ صفاتِ ایزدی کی تجلی کا مسئلہ نہایت دقیق ہے۔ اور اُس کی تشریح و توضیح فلسفیانہ اصطلاحات کی روشنی میں بہت ہی مشکل ہے۔ چنانچہ عرفی نے کہا ہے۔

وزحیرت درشبِ اندیشۂ اوصافِ تو ‏ ‏ ‏ ‏ بس ہا یوں مرغِ عقل از آشیاں انداختہ

اور ہونا بھی یہی چاہئے۔ بھلا ایک قطرۂ بے مقدار کس طرح بحرِ ناپیداکنار کو اپنی آغوش میں لے سکتا ہو اس بنا پر اس حقیقت کے افہام و تفہیم کے لیے بہترین طریقہ مثالوں کا ہی ہوسکتا ہے۔ ہم ذیل میں ایک اور مثال کے ذریعہ اس کی تشریح کرتے ہیں، آفتاب کی روشنی کو دیکھئے۔ اُس کے لیے کوئی خاص مقدار یا شکل نہیں پائی جاتی۔ لیکن اگر اُس کا گذر ایسے روشندان سے ہو جو مثلث یا مربع شکل کا ہو تو خود آفتاب کی روشنی بھی اسی شکل سے متشکل ہوجاتی ہے۔ اب غور کیجئے روشنی اور شکل دو مختلف چیزیں ہیں لیکن صورت یہ ہے کہ روشنی کا گذر روشندان میں سے ہو رہا ہے اور روشندان ایک خاص شکل رکھتا ہے۔ روشندان میں سے گذرنے کی وجہ سے، یا بالفاظ صحیح تر، روشندان کو اپنا جلوہ گاہ بنانے کے باعث روشندان کی شکلِ خاص خود روشنی کے لئے حاصل ہوگئی اور اب آپ اس شکل کا حمل و اتصاف روشنی کے لئے ایسا ہی کرتے ہیں کہ گویا وہ روشنی کے لئے کوئی صفتِ ذاتی ہو۔

صفات لاعین ولاغیر ہیں

مذکورہ بالا مثالوں پر غور کرنے سے علم کلام کے ایک مشہور و معروف مسئلہ کا بھی حل نکل آتا ہے یعنی یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ صفاتِ باری تعالیٰ کو ذاتِ باری سے ایسی نسبت ہو کہ نہ اُن کو عینِ ذات کہہ سکتے ہیں اور نہ غیرِ ذات، کیونکہ سُرخی یا سبزی روشنی سے۔ مثلث یا مربع شکل آفتاب کی دھوپ سے، کمی یا زیادتی آواز سے غیر بھی ہیں اور عین بھی۔ غیر اس اعتبار سے کہ یہ چیزیں

موصوف کی ذات کا عین نہیں ہیں۔ شمع کی روشنی پائی جاتی ہے اور سُرخی یا سبزی کا وجود نہیں ہوتا۔ دھوپ کا وجود پایا جاتا ہے اور شکل مثلث یا مربع کا کہیں پتہ نہیں ہوتا۔ اور عین اس بنا پر ہیں کہ شمع کی روشنی جب تک رنگین شیشوں کے درمیان محصور ہے اور آفتاب کی دھوپ جب تک مثلث یا مربع شکل کے روشندان میں سے گذرتی رہے گی۔ بہرحال شمع کی روشنی کے لئے رنگین اور دھوپ کے لئے مثلث یا مربع ہونا ضروری ہے اور ان دونوں میں سے کسی ایک کا انفکاک دوسرے سے نہیں ہوسکتا۔

حوادث کا قیام ذاتِ باری سے اس تقریر سے ایک اہم مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ متکلمین عام طور سے کہتے ہیں کہ حوادث کا قیام ذاتِ باری کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ یہ کہنے کی بنا پر خدا کی صفات فاعلی کے متعلق طرح طرح کے اشکالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک کلام کے مسئلہ کو ہی لے لیجیے، اگر یہ مطلقاً درست مان لیا جائے کہ ذاتِ باری کے ساتھ حوادث کا تعلق اور قیام ناجائز ہے تو اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر قرآنِ مجید کے الفاظ و حروف اور اُن کی ترکیب و ترتیب جو یقیناً حادث ہیں اُن کو خداوند تعالیٰ کی طرف کس طرح منسوب کرسکتے ہیں۔ حالانکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن مع اپنے الفاظ کے خدا کا کلام ہے۔ جیسا کہ وانزلناہ قرانًا عربیًا اور اسی طرح کی اور متعدد تصریحات سے خود قرآنِ مجید سے ثابت ہے۔ اس اعتراض سے بچنے کے لیے ہی متکلمین نے کلامِ نفسی اور کلامِ لفظی کا فرق کیا ہے۔ اور اُنھوں نے کہا ہے کہ القرآن کلام اللہ غیر مخلوق" جو کہا جاتا ہے تو وہ کلامِ نفسی کے اعتبار سے کہا جاتا ہے، نہ کہ کلامِ لفظی کے لحاظ سے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی تفریق خود قرآنِ مجید کی نصوص کے خلاف ہے اور اس تفریق سے معتزلہ اور اشاعرہ کا اختلاف بھی محض ایک لفظی اختلاف ہو کر رہ جاتا ہے[1]۔

---

[1] بزرگوں سے سُنا ہے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر واقعی قرآن مجید (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

غالباً اس عقدہ کی گرہ کشائی سب سے پہلے حافظ ابن تیمیہ نے کی ہے اُنھوں نے متعدد مواقع پر لکھا ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ حوادث کا قیام ہو سکتا ہے اس مدعا کو ثابت کرنے کے لیے امام عالی مقام کے نزدیک ترتیب مقدمات یہ ہے۔

(۱) قرآنِ مجید سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کلام کیا۔

(۲) یہ کلام اور مخاطبت ازل میں نہیں تھی بلکہ حادث تھی۔

(۳) کلام کے لئے ضروری ہے کہ متکلم کے ساتھ قائم ہو۔

ان مقدمات کی ترتیب سے یہ نتیجہ نکل آتا ہے کہ ذاتِ باری کے ساتھ حوادث کا قیام ہو سکتا ہے حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں "ہمارا یہ قول ایک ایسا قول ہے جس کی صحت پر شرع اور عقل دونوں دلالت کرتے ہیں۔ اور جو شخص یہ نہیں کہتا کہ خدا کلام کرتا ہے، ارادہ کرتا ہے، محبوب اور مبغوض رکھتا ہے۔ راضی ہوتا ہے، لاتا ہے اور آتا ہے، تو وہ اللہ کی کتاب سے مناقضہ کرتا ہے اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰ کو ندا ازل میں دی تھی۔ اور وہ برابر ندا دیتا رہا تو وہ عقل کی بات سے سرکشی کرنے کے ساتھ ساتھ کلام اللہ کی بھی مخالفت کرتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

فَلَمَّا جَاءَهَا نُودِيَ — پس جب موسیٰ وہاں آئے تو اُنکو ندا دی گئی۔

(دیکھئے! اس میں ندا حضرت موسیٰ کی آمد سے موقت ہے) اور ارشاد ہے۔

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ — اللہ کا حکم یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اُس سے کہتا ہے "ہو جا" اور وہ ہو جاتی ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) میں کلام نفسی اور کلام لفظی کی تفریق ہوتی تو پھر امام احمد بن حنبلؒ کو کیا ضرورت تھی کہ وہ کوڑے کھاتے اور مصیبتیں اُٹھاتے وہ کہہ سکتے تھے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ کلامِ نفسی کے اعتبار سے ہے ورنہ کلامِ لفظی تو حادث ہے ہی جیسا کہ معتزلہ کہتے ہیں۔

اس آیت میں "اذا" حرف شرط ہے جو استقبال پر دلالت کرتا ہے[1]" ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ امورِ متجددہ بھی اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہوتے ہیں۔

ایک تنبیہ لیکن اس تقریر سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ حافظ ابن تیمیہ قرآن مجید کے حروف کو مخلوق مانتے ہیں۔ بلکہ اُن کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیزیں جن کو ہم حوادث سمجھتے ہیں وہ اگرچہ ہمارے اعتبار سے حوادث ہی ہیں لیکن جب اُن کے ساتھ خدا کی کسی صفت کا تعلق ہو تو پھر یہ یقین کرنا چاہیئے کہ وہ حوادث محض ہمارے اعتبار سے حوادث ہیں جن میں خدا کی کوئی صفت تجلی کر رہی ہے ورنہ درحقیقت وہ حوادث نہیں ہیں۔ اب ذرا شمع کی مذکورہ بالا مثال کو سامنے رکھ کر غور کرو اور دیکھو کہ جب شمع کی روشنی کا عکس کسی رنگین شیشہ پر پڑتا ہے تو شیشہ کی رنگینی کی وجہ سے خود شمع کی روشنی بھی رنگین ہو جاتی ہے تو اگرچہ روشنی کا یہ رنگ شیشہ کے انعکاس کی وجہ سے ہی ہے، لیکن ہے درا صل شمع کی ہی روشنی۔ اس لئے جو شمع کا حکم ہوگا وہی اس روشنی کا بھی ہوگا پس اسی طرح کلام کی بحث کو سامنے رکھ کر سمجھئے کہ قرآن کے وہ عربی الفاظ و حروف جن سے انسانی کلام مرکب ہوتا ہے، بے شک و شبہ حادث ہیں۔ لیکن جب یہی الفاظ و حروف ہیں پر قیاس کر کے مخلوق نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ حافظ ابن تیمیہ نے اسی مضمون میں ایک جگہ پر اس کی تصریح کر دی ہے فرماتے ہیں۔

"لیکن سلف کا قول یہ ہے کہ اللہ ہمیشہ سے متکلم ہے اور وہ جب چاہتا ہے کلام کرتا ہے اور کلام ایک صفتِ کمال ہے۔ کیونکہ جو شخص کلام کرتا ہے وہ نسبتاً اُس سے اکمل ہوتا ہے جو کلام نہیں کرتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کمال اُن صفات کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے جو موصوف کے ساتھ قائم ہوں، امورِ مبائنہ عن الموصوف سے کمال کا تحقق نہیں ہوتا

[1] کتاب مذہب السلف القویم فی تحقیق مسئلۃ الکلام اللہ الکریم مطبوعہ المنار مصر ص ۱۱۸ و ۱۱۹

پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے صفاتِ کمال کے ساتھ موصوف رہا ہو اور چونکہ اہم صفاتِ کمال میں سے کلام ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کو ماننا پڑے گا کہ وہ متکلم ازلاً وابداً ہے اور جب چاہتا ہے عربی میں کلام کرتا ہے۔ جیسا کہ اس نے قرآن عربی کے ذریعہ کلام کیا۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ جن الفاظ وحروف کیساتھ کلام کریگا وہ اس کے ساتھ قائم ہونگے نہ یہ کہ مخلوق ومنفصل ہوں اس بنا پر وہ حروف جو اللہ کے اسمارِ حسنیٰ کے اور اُس کی نازل کی ہوئی کتابوں کے مبانی ہوں گے وہ مخلوق نہیں ہو سکتے، کیونکہ اللہ نے اُن سے تکلم کیا ہے[1]"

کون نہیں جانتا کہ پانی اُسی وقت پانی ہے جب تک کہ وہ دودھ کے ساتھ نہ ملا ہو لیکن دودھ میں مل جانے کے بعد کوئی اسے پانی نہیں کہتا بلکہ دودھ کہتے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ ایک اور موقع پر لکھتے ہیں۔

"اگر مستلزم الحوادث ممکن بنفسہ ہو یعنی وہ مفعول، معلول اور مربوب کہلائے تو ضروری ہے کہ وہ حادث ہو۔ لیکن اگر وہ واجب بنفسہ ہو تو ضروری نہیں کہ (استلزام للحوادث کی وجہ سے) وہ خود ممکن ہو جائے۔ یہی قول ائمہ اہل الملل واساطین الفلاسفہ کا ہے اور یہی قول جمہور اہلِ حدیث کا ہے[2]۔

عقیدۃ الطحاوی کے فاضل شارح[3] نے بھی اس مسئلہ پر کافی بحث کی ہے اور قریب

---

[1] کتاب مذہب السلف القویم ص ۴۴، ۴۵ [2] رسالہ صفۃ الکلام ص ۵۳

[3] شرح عقیدۂ طحاوی کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے مطبع سلفیہ مصر کا مطبوعہ ہے اس شرح کے فاضل مصنف نے اپنا نام نہیں بتایا، لیکن غالب قیاس یہ ہے کہ اس کے مصنف صدر الدین علی بن محمد بن العز الاذرعی الدمشقی الحنفی المتوفی سنہ ۷۴۶ھ ہیں جو علامہ ابن کثیر کے شاگرد ہیں، اور صاحب کشف الظنون کے بیان کے مطابق افاضل علمار احناف میں سے ہیں

وہی لکھا ہے جو حافظ ابن تیمیہ فرما چکے ہیں۔ ذیل میں ہم اُس کا اقتباس درج کرتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ صفاتِ کمال، صفاتِ ذات اور صفاتِ فعل دونوں کے ساتھ ہمیشہ سے متصف ہے اور ہمیشہ متصف رہے گا، کیونکہ خدا کی تمام صفات صفاتِ کمال ہیں اور اُن میں سے کسی ایک کا نہ ہونا صفتِ نقص ہے۔ اور یہ بھی جائز نہیں ہے کہ اُس کے لیے کوئی صفتِ کمال حاصل ہو، درآنحالیکہ وہ پہلے اُس کی ضد کے ساتھ متصف رہ چکا ہو۔

اس پر صفاتِ فعل اور صفاتِ اختیاریہ مثلاً خلق، زندہ کرنا، مارنا، قبض اور بسط، غضب اور رضا، کا اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ اگرچہ ہم کو اُس کی کنہ اور حقیقت معلوم نہیں ہے، لیکن اصل معلوم ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ امام مالک سے ثم استویٰ علی العرش، کی تفسیر پوچھی گئی۔ تو انھوں نے فرمایا کہ "استواء معلوم ہے لیکن کیف مجہول ہے" ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ احوال ایک وقت میں نہیں ہوتے اور کسی دوسرے وقت میں حادث ہو جاتے ہیں۔ لیکن احوال و افعال کا یہ حدوث ذاتِ خداوندی کے اعتبار سے ممتنع نہیں ہے اور اس پر اس بات کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا کہ وہ عدم کے بعد حادث ہو گئے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ جو شخص کلام کرنے کی قدرت رکھتا ہو۔ اور وہ آج تمہارے سامنے کلام کرے۔ تو تم یہ نہیں کہتے کہ حدث لہٗ الکلام۔ کلام اُس کے لئے حادث ہو گیا ہے۔ البتہ ہاں! اگر کوئی شخص گونگا ہو، کلام کی بالکل قدرت نہ رکھتا ہو۔ اور وہ کسی دن کلام کرنے لگے تو اُس کی نسبت یہ کہا جائے گا کہ حدث لہٗ الکلام، جو شخص بغیر کسی آفتِ سماوی کے خاموش ہو وہ خموشی کے وقت بھی متکلم بالقوہ ہے اور اُس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ جب چاہے کلام کر سکتا ہے پھر جب کلام کرتا ہے تو متکلم بالفعل ہو جاتا ہے۔ پس جس طرح متکلم بالقوہ، بالفعل

کلام نہ کرنے سے یا کوئی کاتب بالقوۃ بالفعل کتابت نہ کرنے سے کسی صفتِ نقص (تکلم اور کتابت کی ضد) سے متصف نہیں ہوتا۔ اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ افعالِ اختیاریہ کا اصطلاحی حدوث باری تعالیٰ کے لئے موجبِ نقص نہیں ہے۔

اس کے بعد عقیدۂ طحاوی کے فاضل شارح لکھتے ہیں:

اور علمِ کلام میں یہ جو کہا جاتا ہے کہ خدا میں حوادث کا حلول نہیں ہو سکتا تو یہ ایک قول مجمل ہے۔ اس کا ذکر نہ کہیں قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر نفی سے مراد یہ ہے کہ خدا کی مقدس ذات میں اس کی محدث مخلوقات میں سے کسی محدث کا نزول اور اس کے لیے کسی وصف متجدد کا حدوث نہیں ہو سکتا۔ تو بے شبہ اس اعتبار سے یہ کہنا ..... کہ خدا میں حلولِ حوادث ممتنع ہے صحیح ہے۔ لیکن اگر اس قول سے مراد یہ ہے کہ خدا سے صفاتِ اختیاریہ کی نفی کر دی جائے اور یہ کہا جائے کہ خدا اپنے ارادہ اور مشیت کے مطابق فعل نہیں کر سکتا اور نہ وہ جب چاہے اور جس طرح چاہے کلام کر سکتا ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ اس اعتبار سے یہ کہنا کہ خدا میں حلولِ حوادث نہیں ہو سکتا بالکل غلط اور باطل ہے۔

بڑی مشکل یہ ہے کہ اہلِ کلام نفی حلولِ حوادث کے الفاظ بہت ہی مبہم طریقہ پر بولتے ہیں راسخ العقیدہ مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کہہ کر خداوند تعالیٰ سے ان چیزوں کی نفی کی جارہی ہے جو اس کی ذات مستجمع الصفات کے شایان نہیں ہیں۔ جب راسخ العقیدہ مسلمان اس کو تسلیم کر لیتا ہے تو پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ نفی حلولِ حوادث سے مراد تو یہ تھی کہ خدا سے صفاتِ اختیاریہ اور صفاتِ فعل دونوں کی نفی کر دی جائے۔"

(شرح عقیدہ الطحاوی ص ۸۶/۸۵)

کلامِ الٰہی یہ جو کچھ عرض کیا گیا، خدا کی عام صفات کے متعلق تھا، ضمناً کلام الٰہی کا بھی تذکرہ آ گیا ہے اب اس پوری تقریر کو سامنے رکھ کر غور کیجئے تو چند نتائج تین طور پر پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) خدا تمام صفاتِ کمال کے ساتھ متصف ہے جن میں سے ایک صفتِ کلام بھی ہے۔

(۲) خدا کی صفات دو قسم کی ہیں ایک صفاتِ ذات اور دوسری صفاتِ فعلی یا فاعلی۔

(۳) صفاتِ فعلی کا ظہور حوادث کی شکل میں ہوتا ہے یعنی حوادث اُن کا مظہر بنتے ہیں۔

(۴) لیکن ان حوادث کو ہم اپنے حوادث پر قیاس نہیں کر سکتے بلکہ صفاتِ فعلی کے ساتھ گہرے ربط کی وجہ سے اُن کا حال بھی وہی ہوتا ہے جو صفاتِ فعلی کا ہوتا ہے۔

اب ان صفات پر کلام کی صفتِ ربانی کو بھی قیاس کیجئے تو اس بات کے ثابت ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا کہ خدا کی صفتِ کلام بھی دو طرح کی ہے ایک صفتِ ذات جو ذاتِ خداوندی کے ساتھ قائم ہے اور جس کے اعتبار سے وہ اُس وقت بھی متکلم تھا جبکہ اُس کے سوا کسی اور چیز کا کہیں وجود نہیں تھا۔ دوسری صفت۔ صفتِ فعل ہے۔ یہ وہ صفت ہے جس کی وجہ سے خدا کا کلام مختلف زبانوں میں مختلف انبیاء پر نازل ہوتا رہا اور آخر میں عربی زبان میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔

قرآن مع الفاظ کے کلام الٰہی ہے فرقِ باطلہ کو چھوڑ کر بعض علماءِ حق تک نے کہا ہے کہ "خدا کی صفت کلام معنیٰ واحد ہے اور اُس میں تعدّد، تکثر، تجزی اور تبعض، مدلول (یعنی معنی و مفہوم) کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ دلالت کے اعتبار سے ہے، اور یہ عبارتیں مخلوق ہیں لیکن ان کو جو کلام اللہ کہا جاتا ہے وہ اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ یہ عبارتیں مدلول پر دلالت کرتی ہیں۔ اگر اس مفہوم کو عربی زبان میں ادا کیا جائے تو وہ قرآن ہے اور اگر عبرانی زبان میں ادا کیا جائے تو وہ توراۃ ہے پس عبارتیں مختلف ہیں لیکن کلام مختلف نہیں ہے"۔ ابنِ کلاب اور ابو الحسن اشعری وغیرہ کا یہی قول ہے۔ لیکن

ائمہ سلفِ صالحین کا فیصلہ اس کے خلاف ہے۔ وہ قرآنِ مجید کو مع الفاظ و معانی کے غیر مخلوق مانتے ہیں اور اوپر جو تقریر گذر چکی ہے۔ اُس کی روشنی میں اگر آپ غور کرینگے تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ سلفِ صالحین کے فیصلہ کو صحیح تسلیم کرنے میں کوئی عقلی استحالہ یا استبعاد بالکل نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ کلام خدا کی صفتِ ازلی و ابدی ہے اور اُس کی ذات کے ساتھ قائم ہے لیکن یہ بھی بے شبہ درست ہے کہ اس صفت کا ظہور و بروز مختلف شکلوں اور صورتوں میں ہوتا رہا ہے اور یہ اَشکال و صُوَر کا اختلاف اصل صفتِ کلام میں نہیں ہوتا بلکہ ان انبیاء کی وجہ سے ہوتا ہے جو مختلف زبانیں رکھتے تھے اور جن پر کلامِ الٰہی کا نزول ہوتا تھا۔ پس اگرچہ یہ اختلافِ اَشکال و صور اصل کلام میں نہیں ہے تاہم مخاطبین کے مختلف احوال و مزایا کے باعث اصل صفت جن مختلف مظاہر میں نظر آ رہی ہے وہ سب مظاہر بھی خدا کی ہی طرف منسوب ہونگے اور شدتِ ارتباط کے باعث ان کا حکم بھی وہی ہوگا جو متجلی کا ہے۔ ایک مرتبہ پھر اُسی شمع والی مثال کو سامنے رکھ کر غور کرو کہ چراغ کی اصل روشنی کی طرح خدا کی صفت کلام بھی مقید اور مطلق ہے لیکن جس طرح اُس روشنی کا عکس کسی رنگین شیشہ پر پڑتا ہے تو خود چراغ کی روشنی کا بھی اُسی رنگ میں نظر آنا شیشہ کے انعکاس کے باعث ہی ہوتا ہے لیکن پھر بھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ شیشہ کی روشنی رنگین ہے بلکہ وہ رنگین روشنی بھی شمع کی ہی کہلاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح یقین کرو کہ کلام الٰہی کی شمع جانفروز بغیر کسی رنگِ تقید و تعین کے اپنی شان اطلاق کے ساتھ ازلاً و ابداً روشن و تابناک ہے۔ لیکن حضرت موسیٰ کے قلب مطہر کا شیشہ اُس نورِ لم یزل سے منعکس ہوا تو اُسی شمع کلام الٰہی کا جلوہ عبرانی شکل میں نظر آیا۔ حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ کے پاک و صاف دلوں کے آئینے اُس روشنی سے عکس پذیر ہوئے تو لوگوں کو اُس شمع کی روشنی زبور اور انجیل کی صورت میں نظر آئی۔ پھر سب سے آخر میں اس شمع کا نور عرب کے ایک قلبِ آئینہ تمثال پر اُس کی بساط و مقدرت کے مطابق پرتو فگن ہوا تو اُس نور کا ظہور

عربی زبان میں ہوا اور قرآنِ مجید کہلایا۔ پھر جس طرح مطلق روشنی اور رنگین روشنی دونوں شمع کی ہیں اور آپ رنگ کو روشنی سے جدا نہیں کرسکتے۔ اسی طرح مطلق کلام اور کلام بزبانِ عربی (قرآن) دونوں خدا کے ہیں اور آپ قرآن کے عربی الفاظ و حروف کو کلامِ الٰہی سے خارج قرار نہیں دے سکتے۔ فافہم و تدبّر

عجب بات ہے کہ خود قرآنِ مجید نے نورِ الٰہی کو اسی تمثیل سے بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ
نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ ط اَلْمِصْبَاحُ
فِیْ زُجَاجَۃٍ ط اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ
دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ
زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ
یَّکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ ط
نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ط یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ
مَنْ یَّشَآءُ ط وَیَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ
لِلنَّاسِ ط وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال اس طاق کی سی ہو جس میں چراغ ہو۔ اور چراغ ایک شیشہ میں ہو شیشہ ایسا چمکتا ہو کہ گویا وہ روشن ستارہ ہو یہ چراغ ایک مبارک درخت زیتون کے تیل سے روشن کیا گیا ہو۔ اس درخت کی نسبت نہ مشرق کی طرف ہے اور نہ مغرب کی طرف۔ تیل ایسا صاف و شفاف ہو کہ وہ آگ کو چھوئے بغیر روشن ہو جائے۔ اللہ نور علیٰ نور ہے وہ جس کو چاہتا ہے اپنے نور کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ اللہ یہ مثال لوگوں کے لئے بیان کرتا ہے اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے معانی اور الفاظ کو لباس اور ملبوس سے تشبیہ دی ہے اور دونوں کو خدا کی طرف منسوب کیا ہے فرماتے ہیں۔

"قرآن کلامِ خداست جل سلطانہٗ کہ بہ لباسِ حرف وصوت در آوردہ بر پیغمبرا علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام منزل ساختہ وعباد را بہ آں امر ونہی فرمودہ چنانچہ ما کلام نفسی خود را بہ توسط کام وزبان در لباسِ حرف وصوت در آوردہ ظاہر می سازیم ومقاصدِ خفیہ خود را در عرصہ ظہور می آریم ہم چنیں حضرت حق سبحانہٗ کلام نفسی خود را بے توسط کام وزبان بہ قدرتِ کاملہ خود لباسِ حرف وصوت عطا فرمودہ بر عباد فرستادہ است و اوامر و نواہی خفیۂ خود را در ضمن حرف وصوت آوردہ بر منصہ جلوہ دادہ است۔

جو لوگ قرآنِ مجید کو صرف معانی کے اعتبار سے وحی مانتے ہیں اور الفاظ کی نسبت خدا کی طرف نہیں کرتے۔ ان کو غور کرنا چاہیئے کہ قرآنِ مجید کی تصریحات سے قطع نظر یہ ایک بالکل واضح امر ہے کہ قلب میں محض معانی کے القاء کے کوئی معنیٰ ہی نہیں جس طرح معانی کا اظہار بغیر الفاظ کے نہیں ہوتا۔ اسی طرح قلب میں ان کا ظہور اور پھر اُن کا تشخص وتعین بھی الفاظ کے بغیر ناممکن ہے چنانچہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ اپنی تصنیف "اسلام میں مذہبی خیال کی تعمیرِ نو" (Reconstruction of religious thought in Islam) میں لکھتے ہیں۔

"جدید علم النفس نے حال ہی میں متصوفانہ شعور وکیفیت کی حقیقت کی طرف توجہ کی ہے اس بلا واسطہ شعور وآگہی کے ذریعہ سالک خدا کو اسی طرح جانتا ہے جس طرح ہم عام چیزوں کو دیکھ کر، یہ شعور و احساس ناقابل تجزیہ ہے اور کسی خارجی وجود کے عکس یا پَرتو کا نتیجہ ہے۔ اس شعور و احساس کی کیفیت کسی دوسرے کے لئے بیان کرنی بھی مشکل ہے۔

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

پیغمبر کا یہ احساس فہم وادراک کا عنصر بھی رکھتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر کا یہ احساس خیال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اُس کے احساس کی خصوصیت ہی یہ ہے

کہ وہ الفاظ کا جامہ پہن کر زبانِ نبوت پر جاری ہوتا ہے۔ احساس دراصل ایک خارجی چیز (Outward Pushing) کا قلب پر وارد ہونا۔ اور خیال اُس کے اظہار (Outward Reporting) کا ذریعہ ہے۔ غیر لفظی اور گونگا احساس اپنے شعور کو خیال کی صورت میں ادا کرتا ہے اور خیال الفاظ کا جامہ پہن کر ظاہر ہوتا ہے گویا یہ کہنا محض استعارہ نہیں ہے کہ خیال اور لفظ دونوں بیک وقت رحمِ احساس سے پیدا ہوتے ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خیال الفاظ سے معرا نہیں ہوتا۔ اپنی ابتدا اور آفرینش کے لحاظ سے دونوں مساوی درجہ رکھتے ہیں، گویا لفظ بھی مُلہم ہے۔ مختصر یہ ہوکہ قرآن لفظاً ومعناً کلام الہٰی ہے۔

روزمرہ کی زندگی میں دیکھئے آپ کسی اچھے اور بیساختہ شعر کو سُنکر کہتے ہیں "یہ تو الہامی شعر ہے" اب بتایئے کہ کیا اس جملہ سے آپ کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس شعر کے صرف معانی الہامی ہیں ؟ ہرگز نہیں ! بلکہ حق یہ ہے کہ معانی کتنے ہی عمدہ اور بلند ہوں۔ اگر الفاظ کا جامہ اُن پر چست نہیں ہو تو آپ کبھی اُس شعر کو الہامی کہہ ہی نہیں سکتے۔

کیا کلام کے لیے نطق ضروری ہے | بعض نادان پوچھتے ہیں کہ اچھا خدا کلام کرتا ہے تو اُس کے لئے نطق بھی ہوگا۔ حالانکہ نطق' اعصاب وعضلات کی مخصوص حرکت کا نام ہے۔ اور یہ حرکت ذاتِ بسیط ومجرد کے لیے نہیں ہوسکتی "۔ جواب یہ ہے کہ اول تو اس شبہ کا جواب پہلے ہی گذر چکا ہے یعنی یہ کہ ہم خدا کی کسی صفت کو اپنی صفت پر قیاس نہیں کرسکتے۔ جس طرح ہمارا ایمان ہے کہ خدا دیکھتا ہے اور سنتا ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ اُس کے دیکھنے اور سُننے کی صورت اور حقیقت کیا ہے ؟ اسی طرح ہم کو بہ طریقِ اذعان ویقین معلوم ہے کہ خدا کلام کرتا ہے۔ لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ اُس کلام کی نوعیت کیا ہے ؟

علاوہ ازیں اس کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ کلام کے لیے نطق کی ایسی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ کسی کا کلام وہ ہے جس سے اُس کے مافی الضمیر کا اظہار ہوا اور یہ اظہار جس طرح زبان کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ہاتھ کے یا کسی اور عضو کے اشارہ سے اور اُس کے علاوہ مختلف طریقوں سے بھی ہوتا ہے۔ فرض کیجئے ایک شاعر اپنی زبان سے ایک حرف نہ کہے اور وہ پوری ایک غزل صفحۂ قرطاس پر لکھ کر ہمیں دیدے تو کیا ہم اُس غزل کو اس بنا پر شاعر کا کلام نہیں کہیں گے کہ اُس نے اس غزل کے الفاظ و حروف کا نطق کیا ہی نہیں ہے۔

کون نہیں جانتا کہ فوجوں میں جھنڈیوں، شیشوں اور اشاروں سے گفتگو کی جاتی ہے اور انھیں ذرائع سے خبریں پہونچائی جاتی ہیں۔ اسٹیشنوں پر، بازاروں میں، اور ٹریفک کے موقعوں پر سبز اور سُرخ روشنیوں سے الفاظ و حروف کا کام لیا جاتا ہے انسان جب تک الفاظ و حروف سے آشنا نہیں ہوا تھا وہ گفتگو کے وقت ہاتھ اور آنکھ کے اشاروں سے مافی الضمیر کا اظہار کرتا تھا۔ ظاہر ہے یہ تمام علامات و اشارات معانی پر دلالت کرنے کے باوصف غیر ملفوظ و غیر منطوق ہیں لیکن اگر ان معانی کو کسی دوسرے تک منتقل کیا جائے تو پھر یہ معانی الفاظ و حروف کا جامہ پہن لیں گے تاہم ان کی نسبت اس شخص کی ہی طرف ہوگی جس نے بولے بغیر کسی علامت کے ذریعہ آپ کو وہ معانی بتائے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپ اور واضح مثال یہ ہے کہ تار گھر میں آپ نے دیکھا ہوگا تار بابو ایک آلہ جس کو انگریزی میں ڈمی (Dummy) کہتے ہیں۔ اُس کے پاس بیٹھ کر انگلیوں کی حرکت سے اس آلہ کو جنبش دیتا ہے اُس کی اس جنبش سے کسی دوسرے شہر میں تار وصول کرنے والا بابو محض گر گٹ گر گٹ کی آواز سنتا ہے اور تار کا تمام مضمون معلوم کر لیتا ہے پھر جب وہ اس مضمون کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتا ہے تو مسلسل ایک با معنیٰ عبارت یا جملہ بن جاتا ہے

ساتھ ہی یہ بھی دیکھیے کہ گرگٹ گرگٹ کی آواز کے ذریعہ تار کا مضمون صحیح صحیح معلوم کرلینا تار وصول کرنے والے (Reciever) بابو کی لیاقت و قابلیت پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر یہ قابل ہے تو وہ مضمون کا ایک ایک حرف ہی وصول نہیں کرتا بلکہ عبارت کا کاما اور ڈیش تک صحیح صحیح وصول کرلیتا ہے۔ پس یہی حال انبیا اور رسل کا ہے، ذات حق میں اور ان میں ایک خاص قسم کا معنوی تعلق ہونے کے باعث ان میں اس بات کی صلاحیت بدرجہ اتم ہوتی ہے کہ مبدا، فیاض کی جانب سے جن معانی و مطالب کا فیضان ایک خاص طریقہ پر ان کے نفوسِ طاہرہ پر ہو وہ انھیں پورے طور پر سمجھ لیں اور چونکہ کسی معنیٰ کا دل میں خطور بغیر الفاظ کے نہیں ہوتا۔ اس لیے انبیاء کرام جب ان معانی کو سمجھتے ہیں تو اس حالت میں سمجھتے ہیں کہ وہ معانی والفاظ کے ساتھ متکیف اور ان کے جامہ میں ملبوس ہوتے ہیں۔ معانی اور الفاظ میں ایسا گہرا تعلق ہے کہ ان میں زمانہ کے اعتبار سے کوئی تقدم وتاخر نہیں ہوتا بلکہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ جب آن معانی کا القاء ہو رہا ہے۔ ٹھیک اسی آن میں الفاظ بھی منجانب اللہ نازل ہو رہے ہیں۔ اور ان الفاظ کا مُلہم بھی وہی ہے جس نے معانی کا القاء قلب میں کیا ہے۔ اب دیکھیے یہاں الفاظ اور معانی دونوں کلام الٰہی کی صورت میں نبی کے قلب پر نازل ہو رہے ہیں اور پھر پائے نطق درمیان میں نہیں ہے ولا غرابۃ فیہ

زبانِ حال کی وسعت گویائی | استدلال کے لیے نہیں بلکہ آنا ً بالجبۃ جو حضرات کلام کا بغیر نطق کے تصور بھی نہیں کرسکتے اس موقع پر ان سے یہ دریافت کرنا غالباً بے محل نہیں ہوگا کہ کیا آپ نے کبھی یہ نہیں سُنا کہ بعض مرتبہ زبانِ حال سے دل کی بات ایسے بلیغ پیرایہ میں بیان ہوجاتی ہے کہ زبانِ قال سے نہیں ہوتی عربی کا ایک شاعر کہتا ہے ؎

وللقلب علی القلب دلیلٌ حین یلقاہٗ
وفی الناس من النا سِ مقائیسٌ واشباہٗ

وفی العین غنی للمرء ان تنطق افواہ[1]

ایک اور شاعر نے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں کہا ہے، اور لطف یہ ہے کہ اس نے زبان چشم کی گویائی کو وحی سے تعبیر کیا ہے۔

ترى عينها عيني فتعرف وحيها وتعرف عيني ما به الوحي يرجع[2]

ایک شاعر آنکھ کے ذریعہ کسی ما فی الضمیر کو اپنے مخاطب پر ظاہر کر دینے کو آنکھ کا نطق بتاتا ہے سُنیئے۔

العینُ تُبدی الّذی فی نفسِ صاحبِها مِنَ المحبّۃِ اوبغضٍ اذا کانا
والعینُ تنطقُ والافواہُ صامتۃٌ حتّٰی تریٰ من ضمیرِ القلبِ تبیاناً

ترجمہ:- آنکھ، خواہ محبت ہو یا بغض بہرحال اس چیز کو ظاہر کر دیتی ہے جو کسی شخص کے دل میں ہوتی ہے۔ اور آنکھ گویا ہوتی ہے درآنحالیکہ منہ خاموش ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ آنکھ دل کی چھپی ہوئی بات کو صاف صاف دیکھ لیتی ہے۔

کتب عقائد کا ایک مشہور عربی شعر ہے جو کلام نفسی کی بحث میں نقل کرتے ہیں

اِنَّ الکلامَ لفی الفُؤادِ واِنّما جُعِلَ اللسانُ علی الفؤادِ دلیلاً

ترجمہ:- کلام تو دراصل دل میں ہوتا ہے زبان تو صرف ظاہر کر دینے والی ہے۔

قرآن مجید میں خدا کی صفت کلام کا ذکر

یہاں تک جو بحث تھی محض عقلی تھی۔ ضمناً کہیں کہیں مدعا کی تائید و تقویت

---

[1] ترجمہ:- اور دل جب دل سے ملتا ہو تو اس کے لئے ایک دوسرے پر دلالت کرنیوالا ہوتا ہے لوگ آپس میں ایک دوسرے کے مماثل اور مشابہ ہوتے ہیں اور آنکھ اس طرح کلام کرتی ہے کہ منہ کو بولنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

[2] ترجمہ:- اس محبوبہ کی آنکھ میری آنکھ کو دیکھتی ہے اور اس کی وحی پہچان جاتی ہے پھر محبوبہ کی آنکھ اس وحی کا جواب دیتی ہے تو میری آنکھ اسے پہچان جاتی ہے۔

کے لئے آیتوں کے حوالے آگئے ہیں۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قرآن مجید میں خدا کی صفتِ کلام کی نسبت کیا کچھ تصریحات ہیں تاکہ آپ انھیں تنقیحاتِ عقلی پر منطبق کرسکیں۔

کلام صفتِ کمال ہے | حضرت موسیٰؑ کے واقعہ میں سامری کے بچھڑے کا جو نقص بتایا گیا ہے اُس میں اِس کا بھی ذکر ہے کہ وہ کلام نہیں کرسکتا تھا۔ ارشاد ہے۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسٰی مِن بَعْدِہٖ مِنْ حُلِیِّھِمْ عِجْلاً جَسَداً لَہٗ خُوَارٌ اَلَمْ یَرَوْا اَنَّہٗ لَا یُکَلِّمُھُمْ وَلَا یَھْدِیھِمْ سَبِیلاً	موسیٰ کے بعد اُن کی قوم نے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑے کا دھڑ بنایا جو گائے کی سی آواز نکالتا تھا، کیا اُن لوگوں نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ بچھڑہ نہ اُن سے کلام کرسکتا ہے اور نہ کسی راستہ کی طرف رہنمائی کرسکتا ہے۔

پھر اسی بچھڑہ کی نسبت اسی سورۃ میں ارشاد ہے۔

اَفَلَا یَرَوْنَ اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْھِمْ قَوْلاً وَلَا یَمْلِکُ لَھُمْ ضَرّاً وَلَا نَفْعاً (اعراف)	کیا وہ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ بچھڑا نہ اُن کی کسی بات کا جواب دے سکتا ہے اور نہ وہ ان کے ضرر و نفع کا مالک ہے۔

سامری بچھڑے کو خدا بتاتا تھا۔ قرآن اس کی تردید کرتا ہے اور بچھڑہ کی عدم الوہیت کی دلیل یہ بیان کرتا ہے کہ وہ تو کلام بھی نہیں کرسکتا تھا اس سے معلوم ہوا کہ خدا کے لئے متکلم ہونا ضروری ہے

خدا کلام کرتا ہے | چنانچہ خدا نے متعدد مواقع پر قرآن میں اپنے کلام کرنے کا ذکر کیا ہے، حضرت موسیٰ کے واقعہ میں ذکر ہے۔

وَلَمَّا جَاءَ مُوسٰی لِمِیقَاتِنَا وَکَلَّمَہٗ رَبُّہٗ (اعراف)	اور جب موسیٰ ہمارے مقررہ وقت پر حاضری دینے کے لیے آیا، اور اُس کے رب نے اُن سے کلام کیا

پھر حضرت موسیٰ کو جو شرف ہمکلامی عطا فرمایا گیا تھا اس کا ذکر اس طرح ہے۔

یٰمُوسٰی اِنِّی اصطفیتُکَ علی النّاسِ بِرِسٰلٰتِی وَ بِکَلَامِی	اے موسیٰ میں نے تجھ کو اپنی پیغمبری اور ہمکلامی سے لوگوں پر برگزیدگی بخشی۔

کسی کو خیال ہوسکتا تھا کہ ممکن ہے اللہ نے سچ مچ کلام نہ کیا ہو، اور کَلَّمَ کی اسناد اللہ کی طرف مجازاً ہو۔ اس شبہ کا ازالہ بھی کردیا گیا۔ فرماتے ہیں۔

وَکَلَّمَ اللّٰہُ موسیٰ تکلیماً	اور اللہ نے موسیٰ سے یقیناً کلام کیا ہے۔

زبان عربی کے رمز شناس جانتے ہیں کہ مصدر سے فعل کی تاکید بیان کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ فاعل سے فعل کا صدور ضرور ہوا ہے۔

ان آیتوں کے علاوہ کئی آیتوں میں اہل جنت سے کلام کرنے کا۔ اور بے ایمان لوگوں سے کلام نہ کرنے کا بھی تذکرہ ہے مثلاً اہل جنت کے باب میں ہے۔

سَلَامٌ قولاً مِن ربٍّ رّحیم	سلامتی ہو، یہ رب رحیم کی طرف سے کہا گیا ہے

بے ایمانوں کے بارہ میں کہا گیا ہے۔

اِنَّ الّذین یشترون بعھدِ اللّٰہ	جن لوگوں نے اللہ کے وعدہ اور اپنی قسموں کو
و ایمانھم ثمناً قلیلاً اُولٰٓئک لاخلاق	تھوڑی سی قیمت میں بیچ دیا ہے اُن کے لئے
لھم فی الآخرۃ ولا یکلّمھمُ اللّٰہ	آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور اللہ نہ ان سے
ولا ینظرُ الیھم	کلام کریگا اور نہ اُن کی طرف دیکھے گا۔

خدا اپنی شان کے مطابق کلام کرتا ہے

صفتِ کلام کے اثبات کے ساتھ ساتھ قرآن کے انداز بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے کلام کی حقیقت وہ نہیں ہے جو ہمارے کلام کی ہے بلکہ اُسکا کلام اُس کی شان الوہیت کے مطابق ہوگا۔ اگرچہ قرآن نے اس مضمون کی تصریح نہیں کی لیکن اُس نے مختلف چیزوں

کے لئے جو کلام کا لفظ بولا ہے اُس سے اس مدعا پر روشنی پڑتی ہے۔ قیامت کے دن انسان کے دست و پا اس کے اعمال و افعال پر جو شہادت دینگے اُن کے ذکر میں ہے۔

الیومَ نختِمُ علیٰ افواھِھِم وتُکلّمنا	آج کے دن ہم اُن کے مونھوں پر مہر لگا دینگے
ایدیھم وتشھَدُ ارجلھم	اور اُن کے ہاتھ ہم سے کلام کرینگے اور اُنکے
(یٰسین)	پیر شہادت دینگے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ کلام کرینگے اور پیر شہادت دینگے۔ لیکن کس طرح؟ اسکی حقیقت نامعلوم ہے۔ اسی طرح کھالوں کے متعلق ارشاد ہے۔

وقالوا لجلودِھم لِمَ شھدتم	اور یہ لوگ اپنی کھالوں سے کہینگے کہ تم نے ہمارے
علینا قالوا اَنطقنا اللّٰہُ الذی	خلاف شہادت کس طرح دی تو وہ کھالیں جواب
اَنطقَ کُلّ شَیءٍ	دینگی کہ ہم کو اُس خدا نے گویا کردیا ہے جس
	نے ہر چیز کو گویا کیا ہے۔

اب دیکھئے! اس آیت میں جلود کے لیے نطق ثابت کیا گیا ہے۔ لیکن اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ نطق کس طرح کا ہے؟ تو اس کے جواب میں بجز اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس کی حقیقت کا علم صرف خدا کو ہی ہے۔ وہ سرگشتۂ ظلمتِ حدوث و امکان انسان جس کا علم وَمَا اُوتِیتُم مِن العلم الاّ قلیلاً کے دائرہ میں محدود ہے، علم کی ان پہنائیوں تک رسائی کا دعویٰ کس طرح کرسکتا ہے۔ بس اس سے سمجھ لو کہ خدا کا کلام اس کی شان کے مطابق ہوگا، ہم اُس کی حقیقت کس طرح متعین کرسکتے ہیں۔

خدا ندا کرتا ہے | البتہ قرآن سے اتنی بات اور ثابت ہے کہ خدا کے لئے ندا بھی پائی جاتی ہے حضرت موسیٰ کے واقعہ میں ہے۔

فَلَمَّا اَتَاھَا نُودِیَ یَا مُوْسٰی اِنِّی — جب موسیٰ درخت کے پاس گئے تو اُن کو ندا
انا رَبُّکَ (طٰہٰ) — دی گئی کہ اے موسیٰ! میں تمہارا رب ہوں

اس سے بھی واضح تر یہ ہے۔

ونادیناہ من جانب الطورِ — اور ہم نے موسیٰ کو طور کی دائیں جانب سے
الایمن (مریم) — ندا دی۔

حضرت آدم کے واقعہ میں ہے

فَلَمَّا ذاقا الشَّجرۃ بدت لھما سواٰتھما — جب آدم اور حوا نے درخت کو چکھا تو انکا ستر
وطفقا یخصفان علیہما من وَرَقِ — ظاہر ہوگیا۔ اور یہ جنت کے پتوں سے اپنا تن
الجنۃ ونادٰھُمَا رَبُّھُمَا الم انھکُمَا — ڈھانکنے لگے اور اُن کے رب نے انکو ندا دی
عن تِلکما الشجرۃِ واقُل لکُما — کہ کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع
اِنَّ الشیطٰنَ لکما عدو مبین — نہیں کیا تھا اور نہیں کہا تھا کہ شیطان تم دونوں
(اعراف) — کا کھلا ہوا دشمن ہے۔

ایک جگہ ہے۔

ویومَ یُنادیھم این شرکائی — اور جس دن خدا ان کو ندا دیگا کہ وہ کہاں
الَّذین کُنتم تزعُمون — ہیں جن کو تم میرا شریک سمجھتے تھے۔

یہ اور ان کے علاوہ اور بھی متعدد آیات ہیں جن میں خدا کے ندا دینے کا ذکر بصراحت مذکور ہے اور چونکہ ندا کا تحقق بغیر صوتِ مسموع کے نہیں ہوتا۔ اس لئے ان آیات سے ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے لئے صوت ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری کی احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے

قرآن اور نطق ربانی لیکن یہ امر قابلِ غور ہے کہ جہاں تک قرآن مجید یا کسی اور آسمانی کتاب کے نزول کا

تعلق ہے اس سلسلہ میں خدا کی ندا یا صوت کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں ہے بلکہ حضرت جبرئیل کو قلم کے ساتھ تشبیہ دے کر غالباً اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جس طرح قلم کے ذریعہ کاتب کا پیغام مکتوب الیہ تک پہونچ جاتا ہے اور آواز نہیں ہوتی اسی طرح خدا کا پیغام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک بغیر کسی نُطق اور صوت کے پہونچا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ — آپ پڑھئے اور آپ کے رب اکرم نے قلم[1]
عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ — کے ذریعہ تعلیم دی ہے اس نے انسان کو وہ
یَعْلَمْ — چیزیں بتائیں جنھیں وہ نہیں جانتا تھا۔

انسانوں سے کلام الٰہی کی صورتیں اس کے علاوہ کلام الٰہی کے سلسلہ میں قرآن نے بتایا ہے کہ خدا انسانوں سے کتنے مختلف طریقوں سے کلام کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ — اور کسی بشر کی یہ مجال نہیں ہو کہ اللہ اُس سے کلام
اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ — کرے مگر وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کے آڑ سے
يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا — یا یہ کہ وہ کسی قاصد کو بھیجے جو اللہ کے حکم سے جو
يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ[2] — کچھ وہ چاہے پہونچائے بے شبہ اللہ تعالیٰ

---

[1] عام مفسرین جبرئیل کے لئے قلم کا استعارہ کرتے ہیں یہ حکمت بیان کرتے ہیں کہ اللہ اور آنحضرت کے درمیان جبرئیل کا واسطہ محض قلم کا سا تھا جس طرح کتابت قلم سے ہوتی ہے لیکن اُسکو کاتب نہیں کہا جاتا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ وحی پہونچتی تھی جبرئیل سے پہونچتی تھی لیکن اُنکی حیثیت قلم سے زیادہ نہیں تھی اور مُوحِی صرف ذات خداوندی تھی۔ اس توجیہ کے خوب ہونے میں کلام نہیں لیکن ممکن ہے اس میں یہ حکمت بھی ہو کہ قلم کے ذریعہ سے جو پیغام پہونچتا ہے وہ بہ نسبت پیغام زبانی کے عالمگیر اور ہر زمان و مکان میں یکساں کارگر ہوتا ہے۔

[2] یہ آیت مشکلات قرآن میں سے ہے۔ اشکال یہ ہے کہ اس آیت میں کلام الٰہی کو (بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

اس آیت میں کلام الٰہی کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ وحی کے ذریعہ سے کلام، پس

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مقسم قرار دے کر اس کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں اور اقسام شے چونکہ آپس میں قسیم ہوتے ہیں اس لئے وہ ایک دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے اس بنا پر خدا کا جو کلام بذریعہ ارسال رسل ہوگا اس کو وحی نہیں کہہ سکتے حالانکہ قرآن مجید سب کا سب بواسطۂ رسول (قاصد) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے اور وہ وحی ہے۔ دوسرا اشکال یہ ہے کہ "او یُرسِلَ رسولاً فیوحی باذنہ ما یشاء" میں فیوحی کو ارسالِ رسل پر متفرع کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی خود ارسال رسل کی ایک قسم ہے حالانکہ آیت کے پہلے حصہ میں کلام الٰہی کو تین قسموں پر منقسم کر کے وحی کو ارسال رسل کا قسیم بتایا گیا ہے۔ تو اب قسیم شے کا قسم بننا لازم آگیا۔ وہو محال۔ حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے مشکلات القرآن پر اپنی یادداشتوں میں اس آیت کا بھی ذکر کیا ہے اور اس آیت کی تقریر اس طرح کی ہے کہ اشکال خود بخود رفع ہو جاتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ "اِلّا وحیاً" اس سے مراد ہے بطریق وحی یعنی مصدر بیانِ نوع کے لئے ہے۔ اور چونکہ خدا نے اس وحی کی اسناد اپنی طرف کی ہے اور مابعد کی دو قسموں کو اس کا مقابل ٹھہرایا ہے اس لئے اس وحی سے مراد القاء فی القلب ہے اور نفث فی الروع (دل میں پھونکنا یا ڈالنا) خواہ یہ بحالتِ بیداری ہو یا بحالتِ خواب۔ اس مخصوص مراد کی وجہ سے وحی کی یہ قسم اپنے دونوں قسموں سے ممتاز ہو گئی۔ "او مِن وراءِ حجاب" اس سے مراد ہے پس حجاب اس طرح کلام کرنا کہ متکلم نظر نہ آئے اور ایک غیبی آواز سنائی دے جیسا کہ حضرت موسیٰ نے سنا یا شب معراج میں آنحضرت کو پیش آیا۔ "او یُرسِلَ رسولاً فیوحی" اس میں ایحاء (وحی کرنے) کی اسناد خدا کی طرف نہیں بلکہ رسول کی طرف ہے۔ اس لئے مراد یہ ہوئی کہ اس صورت میں فرشتہ پیغمبر سے بالمشافہ گفتگو کرتا ہے۔ اس تنقیح سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ ایحاء اول الذکر وحی سے متغائر ہے یعنی ایک وحی بلا واسطہ ہے اور دوسری بواسطہ اور مقابلۃ الشی لنفسہ کا اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

(مشکلات القرآن ص ۲۳۲، ۲۳۳)

پردہ کلام، اور کلام بذریعۂ قاصد۔ ان تینوں قسموں میں سے کسی نہ کسی طریقۂ کلام سے ہر پیغمبر کو شرفِ خطاب عطا فرمایا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ کو کلام پس پردہ کے شرف سے نوازا گیا کہ وادیٔ سینا کے ایک درخت سے اُنھوں نے صوتِ ربانی سُنی۔ باقی رہیں دو صورتیں تو وہ تمام پیغمبروں کے لئے پائی گئی ہیں اور قرآن میں جگہ جگہ اُن کا ذکر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تینوں طریقہائے خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا جس کی تفصیل آگے اپنے موقع پر آئے گی۔

ملکۂ نبوت اور وحی

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ خدا اپنے خاص خاص بندوں سے مختلف طریقوں سے خطاب و کلام کرتا ہے، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء بھی تو آخر ہمارے جیسے انسان ہی ہوتے ہیں۔ پھر اُن میں ایسی کونسی خصوصیت ہے کہ خدا اُن سے کلام کرتا ہے۔ اور وہ خدا کے کلام کو سمجھتے بھی ہیں لیکن اُن کے علاوہ کوئی اور شخص شرفِ خطاب ایزدی سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا؟

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ آپ نبوت کی حقیقت کو تفصیلاً نہیں تو اجمالاً ہی سمجھ لیں۔ امام رازی نے مطالب العالیہ میں امام غزالی نے معارج القدس میں حافظ ابن تیمیہ نے کتاب النبوات اور دوسری تصنیفات میں شاہ ولی اللہ الدہلوی نے حجۃ البالغہ میں اور مولانا محمد قاسم النانوتوی نے تقریر دلپذیر میں اس عنوان کے ماتحت مستقلاً نہایت جامع اور سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ ان سب کا اگر خلاصہ بھی نقل کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن جائے۔ ہم ذیل میں اب ان سب تقریروں کو سامنے رکھ کر نبوت کی حقیقت پر ایک اجمالی بحث کرتے ہیں۔ پہلے بطور مقدمہ چند باتوں کا جان لینا ضروری ہے۔

حکمت (۱) تمام فلاسفہ اس پر متفق ہیں کہ انسان کے انسان کامل ہونے کا دارومدار اُس کے حکمت مآب ہونے پر ہے۔ یہی وہ طغرائے امتیاز ہے جس کے باعث انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے اور یہی وہ شرف و عزت ہے جس کو قرآن مجید میں۔

ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا — اور جسکو حکمت دیگئی اسے بہت بڑی خیر دی گئی

فرما کر بیان کیا گیا ہے۔ حکمت کسے کہتے ہیں ؟ اصولی اعتبار سے اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سب جانتے اور مانتے ہیں کہ انسان میں اصلی قوتیں دو ہیں۔ ایک قوت نظری جس سے انسان اشیاء کے حقائق اور اُن کے حسن و قبح کو معلوم کرتا ہے اور دوسری قوتِ عملی جس کے ذریعہ انسان کوئی عمل کرتا ہے ان دونوں قوتوں میں حاکم کون ہے اور محکوم کون۔ یا افضل و مفضول کس کو کہنا چاہیے ؟ اس کو رہنے دیجئے کہ ہمارے موضوع بحث سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بہرحال یہ مسلم ہے کہ حکمت جس کو کہتے ہیں وہ انھیں دونوں قوتوں کے کمال کا نام ہے۔ کمال سے مراد یہ ہے کہ دونوں قوتیں نہایت صحیح اور تندرست ہوں یعنی اشیاء کے حقائق اور اُن کے حسن و قبح کے متعلق قوت نظری کا فیصلہ بالکل واقعہ کے مطابق ہو اس میں کسی فریب یا کج نظری کو کوئی دخل نہ ہو۔ اسی طرح قوت عملی کے کمال کے معنیٰ یہ ہیں کہ کسی فعل و عمل کے اخذ و ترک پر قوتِ عملی کی تحریک اُس فعل کے حسن و قبح پر مبنی ہو۔ وہ ہم کو صرف اسی فعل کے کرنے پر برانگیختہ کرے جو حسن ہونے کے باعث حقیقتاً قابلِ اخذ ہو۔ اسی طرح وہ اُن افعال سے بہ شدت روکے جو قبیح ہونے کی وجہ سے لائق ترک ہوں۔

مراتب کمال و نقص کا تفاوت | (۲) یہ ظاہر ہے کہ تمام انسانوں میں یہ دونوں قوتیں یکساں نہیں ہوتیں بلکہ ضعف اور قوت، زیادتی اور نقص کے اعتبار سے ان میں بے شمار مراتب مختلفہ پائے جاتے ہیں انھیں مراتب کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح شکل و صورت اور رنگ و روپ میں کوئی ایک شخص پورے طور پر کسی دوسرے شخص کے برابر یا مثل نہیں ہوتا۔ اسی طرح فضائل اخلاق اور ملکاتِ نفسی میں بھی دو انسان ایک دوسرے کے مماثل و مساوی نہیں ہوتے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ مرتبۂ کمال و نقص میں ایک ایک درجہ ایسا ضرور نکلے گا کہ پھر اُس کے اوپر (مرتبۂ کمال میں) یا اُس کے نیچے (مرتبۂ نقص میں) کوئی اور درجہ نہیں ہوگا۔

استکمال و تکمیل | (۳) کسی انسان کی یہ دونوں قوتیں جب مکمل ہوتی ہیں تو اُن کے کمال کا ایک مرتبہ

یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ انسان خود ہی کامل نہیں ہوتا بلکہ اُس کی قوتیں اپنے کمال میں کچھ ایسی مقناطیسی جاذبیت اور کشش بھی رکھتی ہیں کہ وہ دوسروں کو متاثر کرتی ہیں اور دوسروں کی قوت نظری اور قوت عملی کو بھی کمال کی طرف مائل وراغب کر دیتی ہیں۔

ان مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد سمجھئے کہ جس کو نبی کہتے ہیں وہ وہی ہوتا ہے جس کی دونوں قوتیں، نظری اور عملی، انتہا درجہ کی کامل ہوتی ہیں اور وہ دوسروں کی ان قوتوں کو بھی کامل کرسکتا ہے۔

فکر وحدس | یہاں تک جو گفتگو تھی وہ نبوت کی عام حقیقت سے متعلق تھی لیکن چونکہ یہاں ہمارا مطمح نظر نبی کی استعداد وحی سے بحث کرنا ہے جس کا تعلق قوت نظری سے ہے۔ اس لئے ہم یہاں قوت عملیہ کو نظرانداز کرکے قوت نظری کے متعلق ذرا تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہ امر خود بخود واضح ہو جائے گا کہ صرف پیغمبر ہی کیوں کلام الٰہی سے شرف اندوز ہو سکتا ہے۔

تقریر بالا سے یہ تو معلوم ہی ہو چکا ہے کہ نبی کی قوت نظری تمام انسانوں سے زیادہ کامل اور افضل ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ فکر وادراک کے اعتبار سے ایک انسان دوسرے انسان سے مختلف ومتفاوت ہوتا ہے۔ کوئی غبی ہوتا ہے اور کوئی ذہین، پھر غباوت اور ذہانت کے مراتب ومدارج بھی بےشمار ہیں لیکن جانب نقصان وکمال میں دونوں مرتبے ایسے نکلتے ہیں کہ پھر اُن کے اوپر یا نیچے کوئی اور مرتبۂ نقصان وکمال نہیں پایا جاتا۔ ابن سینا نے اشارات میں لکھا ہے کہ ہم مرتبۂ نقصان میں دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ غباوت وبلادتِ طبع کے ایسے اسفل السافلین درجہ میں ہوتے ہیں کہ معمولی سے معمولی بات بھی آپ اُن کو لاکھ مرتبہ سمجھائیں اُن کی سمجھ میں نہیں آتی۔ جانب نقصان کے انتہائی مرتبہ میں ایک ایسے شخص کا موجود ہونا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اُس کے بالمقابل مرتبۂ کمال میں بھی

ایک ایسا شخص ہوگا جو بغیر کسی تعلیم و تعلم کے اپنے نفس کے ادنیٰ التفات سے اُن مشکل سے مشکل مسائل حیات کو بآسانی سُلجھا سکے گا جو دوسروں کے لئے عقدۂ لاینحل ہونگے۔ فلاسفہ ایسے شخص کو صاحب قوّۃ قدسیہ یا صاحب حِدس تمام کہتے ہیں۔

علمار شریعت کی اصطلاح میں جس کو نبی کہتے ہیں اُس کی قوت فکر و حدس کا اندازہ فلاسفہ کے مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ امام غزالی احیار العلوم میں عقل کے مراتب متفاوتہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وَمَنْ انکر تفاوتَ الناس فی	اور جو لوگ اس غریزہ (عقل) میں لوگوں کے
ہٰذہ الغریزۃ فکأنّہٗ منخلعٌ عن ربقۃ	متفاوت ہونے کا انکار کرتے ہیں انھوں نے گویا
العقل وکیف ینکر تفاوتَ	عقل کی رسّی اپنی گردن سے نکال پھینکی ہے
الغریزۃ ولولاہٗ لما اختلف الناس	اور بھلا اس تفاوت فی الغریزۃ کا انکار کس
فی فہم العلوم ولما انقسموا الی	طرح کیا جا سکتا ہے؛ اگر یہ تفاوت نہ ہوتا تو
بلیدٍ لا یفہم بالتفہیم الا بعد تعبٍ	لوگ علوم کے فہم میں مختلف نہ ہوتے اور نہ اُن کا
طویلٍ من المعلم والی ذکی یفہم	انقسام ہوتا ایسے بلید و غبی کی طرف جو تفہیم کے
بادنیٰ رمزٍ واشارۃ والی کامل	بعد بھی نہیں سمجھتا۔ مگر اس وقت جبکہ معلم کو طویل
تنبعث من نفسہٖ حقائق الامور	تعب برداشت کرنا پڑتا ہے اور ایسے ذکی کی
بدونِ التعلیم کما قال تعالیٰ	طرف جو ادنیٰ رمز اور اشارہ سے بات کو سمجھ
"یکادُ زیتہا یضیٓئُ ولو لم تمسسہ	جاتے ہیں۔ اور ایسے کامل کی طرف جس کے
نارٌ نورٌ علیٰ نورٍ" وذالک	اپنے نفس سے بغیر تعلم کے حقائق امور پیدا ہوتے
مثل الانبیاء اذ یتضح لہم	جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قریب ہے کہ زیتون کا

فی بواطنهم امورٌ غامضةٌ من غیر تعلمٍ وسماعٍ ویُعبّرُ عن ذالک بالالهام (ج ا ص ۷۸)

تیل آگ چھوئے بغیر ہی روشن ہو جاتے۔ یہ نور علیٰ نور ہے اور ان کاملوں کی مثال انبیاء کی سی ہے۔ کیونکہ ان کے دلوں میں بغیر تعلم وسماع کے ہی باریک امور واضح ہو جاتے ہیں اور اس کمال کو الہام سے تعبیر کیا جاتا ہے

پھر آگے چل کر اس تفاوت فی العقل کو مثال سے اس طرح سمجھاتے ہیں

وانقسامُ الناس الیٰ من یتنبه من نفسه ویفهم والیٰ من لا یفهم الا بتنبیهٍ وتعلیمٍ والیٰ من لا ینفعه التعلیم ایضاً ولا التنبیه کانقسام الارض الیٰ ما یجتمع فیه الماءُ فیقوی فیتفجر بنفسه عیوناً والیٰ ما یحتاج الیٰ الحفر لیخرج الیٰ القنواتِ والیٰ ما لا ینفع فیه الحفرُ وهو الیابس وذالک لاختلافِ جواهر الارض فی صفاتها فکذالک اختلاف النفوس فی غریزة العقل

(ج ا ص ۷۸)

اور لوگوں کا منقسم ہونا ایسے لوگوں کی طرف جو خود بخود متنبہ ہو جاتے ہیں اور سمجھ جاتے ہیں، اور ان لوگوں کی طرف جو تنبیہ اور تعلیم سے ہی سمجھ سکتے ہیں اور ایسے لوگوں کی طرف جنکو تعلیم نفع بخشتی ہے اور نہ تنبیہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ زمین کئی قسم کی ہوتی ہو بعض زمینیں تو وہ ہوتی ہیں جن میں پانی جمع ہوتا رہتا ہے اور جب زیادہ ہو جاتا ہے تو وہ خود چشموں کی شکل میں بہہ پڑتا ہے اور بعض زمینیں وہ ہوتی ہیں جنھیں کھودنے کی ضرورت ہوتی ہو تا کہ پانی کو نہروں وغیرہ کی طرف منتقل کیا جائے اور بعض زمینیں جو خشک ہوتی ہیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں کھودنا بھی فائدہ نہیں دیتا اور لوگوں کی عقلوں کا مختلف ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ زمین کے جواہر اپنی صفات میں مختلف ہوتے ہیں

اس کے علاوہ امام غزالی نے کتاب المنقذ من الضلال، اور احیاء العلوم میں یہ بھی لکھا ہے کہ نبوت ماوراء عقل ایک مقامِ ادراک و احساس ہے جو انسان کے حواس ظاہرہ اور قوائے باطنہ کے تدریجی ارتقاء کے بعد حاصل ہوتا ہے لیکن جس طرح تمیز و عقل کے مدرکات کے لیے حواس بیکار ہیں اسی طرح اس درجہ کے مدرکات کے لیے عقل بے کار ہے۔ اگر کوئی شخص اس درجہ کا منکر ہے تو اس کا یہ انکار ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی بے عقل کا عقلی امور سے انکار کرنا۔ المنقذ من الضلال میں فرماتے ہیں۔

بل الایمان بالنبوۃ ان تقر	بلکہ نبوت پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ یہ اقرار کیا
باثبات طور وراء العقل تنفتح	جائے کہ عقل سے بالاتر ایک مقام ہے جس میں
فیہ عینٌ یُدرکُ بہا مدرکاتٌ	آنکھ کھل جاتی ہے اور اُسکے ذریعہ سے خاص خاص
خاصۃٌ والعقل معزولٌ عنہا	مدرکات کا ادراک کیا جاتا ہے اور عقل ان
کعزل السمع عن ادراکِ	مدرکات کے ادراک سے ایسی ہی
الالوان[1] الخ	عاجز ہے جیسے کان رنگوں کے ادراک سے

اس بنا پر نبوت کا اصل اذعان و یقین امام صاحب کے نزدیک صرف اُس شخص کو ہی ہو سکتا ہے جس کو خود نبوت کا مقام حاصل ہو یا جو نفس قدسی رکھنے کے باعث مابعد الطبیعی حقائق کو معلوم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ چنانچہ اپنی حالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وبالجملۃ من لم یُرزق منہ شیاً	اور خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو اسکا ذوق نہیں دیا
بالذوقِ فلیس یُدرک من حقیقۃِ	گیا ہے وہ نبوت کی حقیقت کے سلسلہ میں بجز نام
النبوۃ الا الاسم	کے اور کسی چیز کا ادراک ہی نہیں کر سکتے۔

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

[1] ص ۳۱

فلاسفہ کی تعبیر کے مطابق ان ارباب نفوس قدسیہ کا دل آئینہ کی طرح مجلیٰ اور مذکیٰ ہوتا ہے جس میں عقلِ فعال کی طرف سے جو تمام معقولات اور صورِ معنویہ کا خزانہ ہے۔ حقائق کا انعکاس ہوتا رہتا ہے اور اس فیضان و تاثر کی وجہ سے وہ بڑی سے بڑی نظری چیزوں کا علم حاصل کر لیتے ہیں جو دوسروں کو بڑی مشق و مہارت کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتا اور یہ علم شائبہ تردد و شک سے آلودہ ہونے کے باعث قطعی اور حتمی ہوتا ہے۔

ملکۂ نبوت وہبی ہے کسبی نہیں

آئینہ کی مثال سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ملکۂ نبوت ہر شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ خاص موہبتِ خداوندی ہے جو کسی کسی کو عطا فرمائی جاتی ہے قرآن مجید میں ہے۔

اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہٗ — اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنا پیغمبر کس کو بنائے

آپ دیکھتے ہیں آفتاب جہاں تاب طلوع ہو کر کائناتِ عالم کے ذرہ ذرہ پر جلوہ پاش ہوتا ہے اور اُس کی شعاعیں در و دیوار، مٹی پتھر، گھاس اور کوڑا کرکٹ ہر چیز پر پڑتی ہیں۔ لیکن جب یہی شعاعیں کسی آتشی شیشہ پر پڑتی ہیں تو وہ اُس کو جگمگا دیتی ہیں، یہاں تک کہ خود اُس میں سے شعاعیں چھن چھن کر دوسری چیزوں پر جو اس کے بالمقابل ہوتی ہیں عکس ریز ہونے لگتی ہیں اسی طرح یقین کرو کہ وجودِ ابدی و سرمدی کا خورشید حقیقت اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ روشن ہے اور بلا امتیاز ما و شما ہر چیز کو اپنی شعاعوں سے متفیض کر رہا ہے، لیکن یہ اپنی اپنی فطری و جبلی استعداد کا فرق ہے کہ ہر چیز اُس سے اپنی فطری صلاحیت کے مطابق ہی کسب فیض کر سکتی ہے۔ انبیاء کے نفوسِ قدسیہ اگر اس آفتاب حقیقت کی نورانی شعاعوں کو جذب کر کے خود منور ہوتے ہیں اور دوسروں کو منور کر دیتے ہیں تو اس لئے کہ وہ آتشی شیشہ کی طرح اس کی فطری استعداد رکھتے ہیں۔ اور اگر ہم ان انوار و تجلیات سے براہ راست اکتسابِ نور نہیں کر سکتے تو اس کی وجہ

یہ ہے کہ ہمارے دل اور قوا ر مدرکہ اُس لوہے کی طرح ہیں جس کو جلا نہ پانے کی وجہ سے آئینہ کا ہمسر ہونے کا حوصلہ نہیں ہوسکتا۔ الغرض

ہر چہ ہست از قامتِ ناساز و بے اندامِ ماست   ورنہ تشریف تو بر بالائے کس ناساز نیست

شہیدی نے بھی اُردو میں اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

عام ہیں اُسکے تو الطاف شہیدی سب پر   تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

یہی وہ عام فطرتِ انسانی سے مافوق باطنی استعداد ہوتی ہے جس کی وجہ سے انبیاء کے حواس عام انسانی حواس سے بہت زیادہ تیز اور اُن کا شعور و ادراک دوسرے لوگوں کے شعور و ادراک سے کہیں زیادہ بلند اور اعلیٰ ہوتا ہے۔ اب وہ خدا سے ہم کلام ہوتا ہے۔ استوانۂ حنانہ کے گریہ کی آواز سن سکتا ہے کنکریوں کی تسبیح سے اُس کے کان آشنا ہوتے ہیں اور وہ مسافت اور مکان و زمان کی حدود و قیود سے گذر کر اپنی آنکھ اور کان سے وہ سب کچھ دیکھ اور سن سکتا ہے جو دوسرے رگ تو بر تو حجابات نظر و سمع کی وجہ سے دیکھ اور سُن نہیں سکتے۔ حریم اسرار ازل کے محرم راز حضرت مولانا رومی فرماتے ہیں

فلسفی منکر شود در فکر و ظن   گو برو سر را بران دیوار زن

نطقِ آب و نطقِ باد و نطقِ گِل   ہست محسوسِ حواسِ اہلِ دل

فلسفی کو منکرِ حنانہ است   از حواسِ انبیا بیگانہ است

ایک اور نظریہ شیخ الاشراق اور بعض دوسرے صوفیا و فلاسفہ اسلام کا ایک نظریہ یہ ہے کہ کائنات ہستی تین عالموں کے مجموعہ کا نام ہے جن کو موالیدِ ثلاثہ کہا جاتا ہے۔ یعنی جمادات۔ نباتات اور حیوانات ان ہی سے ہر عالم کی انتہا ایک ایسی نوع پر ہوتی ہے جس میں اپنے جنسی و نوعی خصائص کے ساتھ دوسرے عالم کے بعض خصائص بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً جمادات میں مونگا ایک ایسی چیز ہے جس میں نباتات کی ایک خاصیت نشو و نما پائی جاتی ہے۔ اب ہم نباتات کو دیکھتے ہیں تو اس میں

بھی ایک ترقی یافتہ نوع کھجور کی نظر آتی ہے جس میں حیوانات کی طرح تذکیر و تانیث کا فرق و امتیاز ہوتا ہے اور اُن کے مذکر و مونث کے پیوند سے جس کو عربی میں تابیر کہتے ہیں کھجوریں پیدا ہوتی ہیں ہندوستان میں ارنڈ خربوزہ یا پپیتا اور آم کی بعض قسموں کے متعلق بھی یہی بیان کیا جاتا ہے۔ پھر حیوانات کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ حیوان کی انتہا ایک ایسی قسم مثلاً بن مانس پر ہوتی ہے جس میں بعض انسانی خصائص پائے جاتے ہیں۔ پس جس طرح خاص خاص جمادات میں نباتات کے۔ اور خاص خاص نباتات میں حیوانات کے خصائص پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح نوع انسان میں بعض انسان ایسے پائے جاتے ہیں جن میں ملکوتی خصائص ہوتے ہیں۔ پھر ان ملکوتی خصائص رکھنے میں بھی فرقِ مراتب ہوتا ہے۔ اب ہم کہتے ہیں کہ وہ انسان جس میں تمام ملکوتی الصفات انسانوں سے بڑھ کر ملکوتی خصائص و صفات پائے جائیں شریعت و مذہب کی اصطلاح میں وہی نبی کہلاتا ہے اس اہم خصوصیت کی وجہ سے نبی کے حواسِ باطنہ و ظاہرہ اس حواس میں ہی محدود نہیں ہوتے بلکہ ان کے علاوہ اس کو بعض ایسے حواس بھی عطا ہوتے ہیں جنکی وجہ سے عالمِ مجردات کیساتھ قریبی اتصال ہوتا ہے اس اتصال کے باعث وہ خدا کا کلام سُن سکتا اور سمجھ سکتا ہے اور اس کی آنکھیں ایسے جلووں سے روشن ہوتی ہیں جن کی دید کی تاب چشمِ ظاہر لا ہی نہیں سکتی عارف باللہ مولانا رومی نے بھی مثنوی میں متعدد مواقع پر اس مضمون کو بیان کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں۔

پنج حسے ہست جز ایں پنج حس — آں چو زرِ سرخ و ایں حسہا چو مس
حسِ ابداں قوتِ ظلمت خورد — حسِ جاں از آفتابے می چرد
ہر کہ از حسِ خدا دیدہ آیتے — در برِ حق دانست بہتر طاعتے
گر بدیدے حسِ حیوان شاہ را — پس بدیدے گاؤ و خر اللہ را
گر نبودے حسِ دیگر مر ترا — جز حسِ حیواں ز بیرونِ ہوا

پس بنی آدم مکرم کے بود — کے بحسِ مشترک محرم شدے

جو لوگ مادیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور جن کی قوتِ فکر و نظر اس درجہ محدود ہے کہ وہ جسم اور مادہ کی حد بندیوں سے گذر کر روح اور عالمِ مجردات کی باتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ انکو تعجب ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یا کسی اور نبی کو بشر ہونے کے باوصف ایسا کونسا مقام پیش ہے جس میں آپ حواسِ ظاہری سے بے تعلق ہو کر عالم یقین و مشاہدہ کی حقیقتوں کو علیٰ وجہ البصیرت دریافت کر سکیں، اور پھر انھیں محفوظ بھی کر لیں! لیکن یہ لوگ اگر ذرا وسعتِ نظر سے کام لے کر اپنے احوالِ گرد و پیش کا جائزہ لیں اور زندگی کے بعض نادر اور اہم واقعات کا عمیق نظر سے مشاہدہ کریں تو انھیں اس دنیا میں ہی بعض ایسی مثالیں مل جائینگی جن سے وحی و الہام، اور عالمِ مجردات سے تعلق کی نسبت ان کا استبعاد دور ہو سکتا ہے اور وہ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ہمارے حواس ظاہرہ و باطنہ کے علاوہ بھی خاص خاص لوگوں میں بعض ایسی خاص قوتیں ہوتی ہیں جن کے ذریعہ وہ بالکل حواس کی طرح اشیاء کو محسوس و معلوم کر سکتے ہیں۔

کم و بیش تین برس پہلے کی بات ہے، پنجاب کا ایک شخص خدا بخش نامی دہلی آیا تھا۔ اور اس نے اپنے ایک عجیب و غریب باطنی کمال کا مظاہرہ نئی دہلی کے ایک مشہور و متمول سکھ کی کوٹھی پر کیا تھا۔ اس مظاہرہ میں دہلی کے چند عمائد کے ساتھ اخبار اسٹیٹسمین کا نمائندہ بھی موجود تھا۔ نمائندہ نے اپنے چشم دید واقعہ کے متعلق جو رپورٹ اخبار میں درج کرائی تھی۔ اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"خدا بخش کی دونوں آنکھوں پر کپڑے کی ایک بہت موٹی پٹی باندھ دی گئی جس کے بعد کسی چیز کو دیکھنے کا امکان ہی نہ تھا۔ اسکے بعد اُس سے ایک ایسے کمرہ سے گذرنے کے لئے کہا گیا جس میں جابجا منتشر کرسیاں اور میزیں بغیر کسی ترتیب کے ڈالدی گئی تھیں، خدا بخش اسی حالت میں ایک بالکل تندرست بینا انسان کی طرح کرسیوں سے بچتا بچاتا کمرہ سے باہر نکل گیا۔ اسکے بعد خدا بخش کے کہنے پر اس کو اُردو

اور انگریزی کے بعض اخبارات جن میں اخبار اسٹیٹسمین بھی تھا، پڑھنے کے لئے دیئے گئے اور مختلف جگہوں سے پڑھنے کے لیے کہا گیا شخص موصوف نے انہیں بھی صاف صاف بغیر کسی وقت و دشواری کے اس طرح پڑھ دیا کہ گویا اُس کی آنکھوں اور اخبارات کے درمیان کوئی چیز حائل ہی نہیں ہے۔ کمال کا مظاہرہ کرنے کے بعد خدا بخش نے ایک تقریر کی جس میں اُس نے بتایا کہ دراصل انسان کے دماغ میں آگے کی جانب بعض ایسے بہت ہی چھوٹے چھوٹے غدود ہیں جن سے اگر مشق و ممارست بہم پہونچائی جائے، آنکھوں کا کام لیا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر آنکھیں بالکل ضائع ہو جائیں اور قوت بینائی باقی نہ رہے تو انسان ان غدودوں کے ذریعہ چیزوں کو دیکھ سکتا اور کتاب وغیرہ پڑھ سکتا ہے۔ تقریر کے آخر میں خدا بخش نے کہا کہ میں نے سالہائے دراز کی مشق کے بعد یہ کمال حاصل کیا ہے۔ لیکن میں اب بھی اس پر قانع نہیں ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھ کو اس قوت میں ابھی اور اضافہ کرنا ہے۔"

بعض واقعات ایسے بھی نظر سے گذرتے ہیں کہ انتہائی حیرت انگیز ہوتے ہیں۔ آدمی اُن کا مشاہدہ کرتا ہے، لیکن کوئی عقلی یا منطقی تعلیل و توجیہ نہیں کر سکتا۔ مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی رفیق اعلیٰ ندوۃ المصنفین سانپ کے کاٹے کا ایک کامیاب عمل جانتے ہیں جس کا خود میں نے اپنے اکابر و احباب کے ساتھ متعدد بار عینی مشاہدہ کیا ہے۔ اس عمل کے لئے خود مار گزیدہ کا مولانا موصوف کے سامنے موجود ہونا شرط نہیں ہے وہ خواہ کتنے ہی فاصلہ پر ہو کوئی مضائقہ نہیں۔ مولانا کو جو شخص اس واقعہ کی اطلاع دے گا وہ اسے فوراً تھوڑا پانی کچھ پڑھ کے اور دم کر کے پلائینگے۔ خدا کی شان، ادھر پانی کا گھونٹ اس مخبر کے حلق سے نیچے اتریگا اور ادھر مار گزیدہ سے زہر کا اثر کم ہونے لگے گا یہاں تک کہ تھوڑی دیر کے بعد بالکل جاتا رہے گا۔

اب ان واقعات پر غور کرو، اور بتاؤ کہ وہ لوگ جنھوں نے اپنی آنکھ سے ان کا مشاہدہ

کیا ہے کیا وہ ایک لمحہ کے لیے بھی ان کو درست ماننے میں تامل کرینگے؟ ہرگز نہیں، تو پھر وہ کوئی ان واقعات وحقائق کی منطقی وعقلی توجیہ وتاویل بھی کر سکتے ہیں؟ بالکل نہیں۔ بلکہ دیکھنے والوں کو اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ بعض بعض انسانوں میں غیر معمولی ذہانت وذکاوت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان سے ایسے عجیب وغریب اور محیر العقول کارنامے سرزد ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر ہم فرطِ حیرت و استعجاب سے انگشت بدنداں تو ہو سکتے ہیں مگر اس کو سمجھ نہیں سکتے۔ اسی طرح مارگزیدگی کے عمل کو دیکھ کر اس بات کا تو یقین ہو جاتا ہے کہ دواؤں اور جڑی بوٹیوں کی طرح بعض الفاظ و کلمات میں بھی ایسا اثر ہوتا ہے کہ وہ زہر کا اثر زائل کر دیتے ہیں لیکن یہ کیونکر؟ اور کس طرح؟ اور انھیں الفاظ کی یہ خصوصیت کیوں ہے؟ دوسرے لفظوں میں یہ اثر کیوں نہیں پایا جاتا؟ اور اچھا لفظوں میں تریاقی اثر ہے تو ہوا کرے آخر یہ کیا معاملہ ہے کہ ان الفاظ کا دم کیا ہوا پانی پیتا ہے ایک بالکل غیر متعلق شخص جس نے آکر خبر دی ہے اور اچھا ہو جاتا ہے مارگزیدہ؟ یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں جن کا کوئی حل نظر نہیں آتا اور انسان کے لیے بجز اس کے کوئی اور چارہ کار نہیں رہتا کہ وہ اپنی عقل وفہم کی نارسائی کا اقرار کرے۔ اور جو کچھ دیکھ رہا ہے۔ یا جس کو معتبر اور سچے راویوں سے سُنا ہو اس کے ہونے کا یقین کرے۔ کتنی ہی عجیب وغریب خبریں ہیں جن کو آپ روزانہ اخباروں اور رسالوں میں پڑھتے ہیں اور اُن کو محض اس بنا پر سچ مان لیتے ہیں کہ کسی معتمد اخبار کے نامہ نگار نے انکو بیان کیا ہے۔ یا چند امریکہ اور یورپ کے ڈاکٹروں نے اُن کا ذاتی طور پر تجربہ کیا ہے۔

نظر کو ذرا وسیع کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ صفات وخصائص کا یہ فرق و امتیاز انسانوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اتحادِ جنسی و نوعی کے باوجود ایک نوع کے مختلف افراد میں ہی بعض انفرادی خصوصیات کے باعث اتنا عظیم الشان فرق پایا جاتا ہے کہ ان پر مختلف انواع سے تعلق رکھنے کا شبہ ہوتا ہے۔ مٹی اور پتھر۔ اور لعل ویاقوت سب جمادات ہیں۔ مگر ایک تاجِ سلطانی اور قبائے شاہی

کی زینت بنتا ہے اور دوسرا کم ارز ہونے کی وجہ سے انسانوں اور چوپاؤں کے قدموں سے ٹھکرایا جاتا ہے۔ پھر لعل اور یاقوت بھی سب ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ بعض لعل ایسے ہوتے ہیں کہ بیش بہا بلکہ بے بہا ہونے کے باعث بڑی سے بڑی سلطنت کے خزانہ کے لئے سرمایۂ فخر و ناز ہوتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ایسے لعل گنتی میں دو تین سے زیادہ نہیں ہوتے اور ان کے بالمقابل دوسرے لعل ایسے ہوتے ہیں جن کو صورت و شکل اور رنگ میں یکساں ہونے کے باوجود ہر متمول اور صاحبِ ثروت انسان کی جیب خرید سکتی ہے۔ خوب اچھی طرح غور کرو، لعل و عقیق اور زمرد و گوہر کیا ہیں؟ پتھر ہی تو ہیں مگر پھر یہ کیا ہے کہ ایک پتھر پتھر ہی رہا۔ دوسرے پتھر کو آفتاب کی شعاعوں نے اپنے مسلسل عمل تربیت سے لعلِ درخشاں اور یاقوتِ تاباں بنا دیا حالانکہ آفتاب کی شعاعیں دونوں پر یکساں ہی پڑتی ہیں۔ جس کو تم آئینہ کہتے ہو کیا اس کی حقیقت لوہے سے کچھ مختلف ہے؛ پھر اسکی کیا وجہ ہے کہ صنّاع کے دستِ مہارت نے لوہے کے ایک ٹکڑے کو صاف و شفاف روشن آئینہ بنا دیا۔ جو سورج کی شعاعوں کو اپنے سینہ میں جذب کرکے اپنے مقابل کی چیز پر عکس فگن ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس دوسرا لوہا وہی لوہا رہا جو دستِ آہنگر سے آگ کی بھٹی میں جلتا ہے اور پھر سوہان پر ہتھوڑے کی ضرب کھاتا ہے۔ پھول پھول سب برابر ہیں، لیکن عجیب بات ہے کہ ایک پھول اپنی جاں نواز خوشبو سے قلب و دماغ میں عطر کی لہریں دوڑا دیتا ہے اور اس بنا پر کسی کے کاکلِ عنبر آگیں کی زینت، یا کسی کی دستارِ عزت و افتخار کی رونق بنتا ہے۔ اور دوسرے پھول اس سے کم یا بالکل خوشبو نہ رکھنے کے باعث جس ٹہنی پر اپنی آنکھ کھولتے ہیں، بالآخر اسی پر بادِ خزاں کے جھونکے کی تاب نہ لاکر فنا ہو جاتے ہیں۔ یہ سب چیزیں تو خیر پھر بھی جواہر یعنی قائم بالذات ہیں الفاظ تو اعراض ہی ہیں، آپ نے سانپ کے عمل کا حال پڑھ کر اندازہ کر لیا ہوگا کہ خود ان میں بھی حیثیت ملفوظیت میں برابر ہونے کے باوجود کتنا عظیم الشان فرق و امتیاز ہوتا ہے۔

پس جب آپ عالم ہست و بود کی متحد النوع اشیا میں صفات و خصائصِ انفرادی کے باعث اتنا اختلاف پاتے ہیں تو پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ انسانوں میں ایک انسان اپنے غیر معمولی قوئ باطنیہ یا کسی ایک خاص قوت کی زیادتی کی وجہ سے عام انسانوں کے برخلاف خدا سے شرفِ ہم کلامی حاصل کرے۔ جس طرح سالہاسال دراز کے بعد آفتاب کا فیضِ اثر ایک معمولی سے پتھر کو لعل و عقیق کی شکل میں تبدیل کر کے اسے کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے۔ اسی طرح یقین کرو خورشیدِ حقیقت کے انوار و تجلیات جب اپنے مخصوص فیضان و اثر کے لیے کسی خوش نصیب انسان کو چُن لیتے ہیں تو پھر وہ دنیا میں نبی بن کر ظاہر ہوتا ہے اور اُس سے ایسے معجزے صادر ہوتے ہیں جن کو دوسرے لوگ نہیں کر سکتے۔ اور جس طرح لعل و عقیق روز روز نہیں پیدا ہوتے۔ اسی طرح انبیاء کرام بھی کبھی کبھی مبعوث ہوتے رہے ہیں۔

سالہا باید کہ تا یک سنگِ اصلی ز آفتاب — لعل باشد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

اور اب چونکہ ہمارے اعتقاد میں معدنِ ہستی کا وہ "کوہِ نور" ہیرا جو یوم الست سے ذاتِ احدیت کے آفتابِ عالم تاب کی آغوشِ مشیت میں تربیت پا رہا تھا۔ اور جس کی آمدِ موعود کے انتظار میں کائناتِ عالم کا ذرہ ذرہ شب و روز کی .... ایک ایک ساعت بڑی بے چینی اور اضطراب سے گن رہا تھا، اس جہانِ آب و گِل میں جلوہ فرما ہو کر دنیائے اخلاق و انسانیت کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ کو منور کر چکا اس لئے اب آئندہ اس نوع کا کوئی گوہرِ گراں مایہ (نبی) دنیا میں نہیں آئے گا۔ البتہ ہاں اس سے کم درجہ کے جواہر ہر زمانہ میں موجود رہیں گے اور اُس ہیرے کی قائم مقامی کا فرض انجام دیتے رہیں گے۔

نبی کی بشریت یہاں تک نبی کی اُس قوت کا ذکر تھا جس کے ذریعہ وہ خدا کا کلام سن سکتا اور سمجھ سکتا ہے۔ اب ہم نبی کی پیغمبرانہ حیثیت پر ایک دوسرے پہلو سے بحث کرتے ہیں۔

چونکہ نبی اللہ اور اُس کے بندوں کے درمیان خدمتِ سفارت و رسالت انجام دینے کے لیے آتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس میں ملکۂ نبوت اور استعدادِ وحی کے ساتھ بشریت بھی پائی جائے تاکہ وہ ملکۂ نبوت کے ذریعہ خدا کا کلام سنے اور بشر ہونے کی وجہ سے عام انسانوں تک اس پیغام و کلام کو پہونچا سکے اور اپنے عمل و قول سے اُس کی تشریح و تفہیم بھی کرسکے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرآن میں ارشاد ہے۔

ولو جعلناہُ مَلَکاً لجعلناہُ رَجُلاً (انعام)	اور اگر ہم فرشتہ کو پیغمبر بناتے تو اسے بھی آدمی کی ہی شکل میں بھیجتے

قاضی بیضاوی نے اس مسئلہ کی توضیح ایک نہایت عمدہ مثال سے کی ہے۔ آیت "واذ قالَ رَبُّکَ للملائکۃِ انی جاعلٌ فِی الارضِ خلیفۃً" کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

الا ترىٰ انَّ الانبیاءَ لما فاقت	کیا تم نہیں دیکھتے کہ چونکہ انبیاء کی قوت فائق اور
قوتُهم واشتعلت قریحتُهم بحیث	ان کی طبیعت اس درجہ روشن ہوتی ہو کہ گویا
یکادُ زیتُها یُضیٓئُ ولو لم تمسسہ	زیتون کا تیل آگ چھوئے بغیر خود بخود روشن
نارٌ ارسل الیهم الملائکۃَ ومن منهم	ہے اس لئے خدا ان کے پاس فرشتے بھیجتا ہے
اعلیٰ رُتبۃً کلّمہٗ بلا واسطۃٍ کما کلّمَ	اور جو زیادہ اونچے مرتبے والے ہوتے ہیں ان
موسیٰ علیہ السلامُ فی المیقات	سے بے واسطہ کلام کرتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ سے
ومحمداً صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃَ المعراج	میقات میں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے شب
ونظیرُ ذالک فی الطبیعۃِ ان العظم	معراج میں کیا، طبیعیات میں اس کی نظیر یہ ہے
لما عجز عن قبولِ الغذاء من اللحم	کہ چونکہ تباعد کی وجہ سے ہڈی گوشت سے غذا
لما بینهما من التباعد جعل الباری	قبول نہیں کرسکتی اس لئے اللہ نے اپنی حکمت

تعالیٰ الحکمۃ بینہما الغضروف آلمناسبت سے ان دونوں (گوشت اور ہڈی) کے درمیان
لما لیاخذ من ہذا ویعطی ذالک چبنی ہڈی پیدا کردی جو دونوں سے مناسبت
رکھتی ہے تاکہ وہ غذا اس سے لے اور اسکو دے

غرض یہ ہے کہ انبیاء کرام میں جسمانیت اور روحانیت کا ایسا پاکیزہ امتزاج ہوتا ہے کہ
ایک طرف وہ بشر ہوتے ہیں اور دوسری جانب اُن کی رسائی خطیرۃ القدس کے اُس مقام جلیل
وعظیم تک ہوتی ہے جہاں جانے کا حوصلہ جبرئیل امین کو بھی نہیں ہوتا؎

اگر یک سرموئے برتر پرم فروغِ تجلی بسوزد پرم

اس بنا پر صرف انبیاء ہی اللہ اور اُس کے بندوں کے درمیان سفارت و رسالت کی خدمات
انجام دے سکتے ہیں۔ عام انسانوں کی طرح فرشتے بھی اس خدمت کو ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

وحی اور محققینِ یورپ

اہلِ مغرب تمام مذہبی قوموں کی طرح سولہویں صدی تک وحی کے قائل رہے۔ کیونکہ اُن کی کتابیں انبیاء کے حالات و واقعات سے پُر تھیں جب سائنس کا دور شروع ہوا، اور روحانیات سے ہٹ کر لوگوں کی توجہ مادیات کی طرف زیادہ ہوگئی، تو پھر فلسفۂ مغرب نے اعلان کیا کہ وحی کا مسئلہ بھی اُن پرانے خرافات میں سے ہے جو جہالت و نادانی اور وہم پرستی کے باعث انسانوں کے قلب و دماغ پر اب تک مسلط رہے ہیں۔ اس فلسفہ نے مابعد الطبیعی حقائق کے انکار میں اس درجہ غلو کیا کہ سرے سے خدا اور روح کا ہی انکار کر دیا۔ اس سلسلہ میں وحی کی نسبت کہا گیا کہ یہ یا تو نبوت کا دعویٰ کرنے والوں کی اختراع ہے جو انھوں نے لوگوں کی توجہات کو اپنی طرف مائل و راغب کرنے کے لئے اختیار کر لی ہے اور یا کسی قسم کا ہذیان ہے جو بعض اعصاب کے مریضوں کو لاحق ہو جاتا ہے اس بنا پر اُن کو بعض چیزوں کی صورتیں متمثل نظر آتی ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں اُن کی کوئی اصلیت نہیں ہوتی۔

فلسفہ یورپ نے وحی اور دوسری مابعد الطبیعی چیزوں کی نسبت اپنے اس نظریہ کا اس زور و شور سے پروپگینڈا کیا کہ یہ نظریہ فلسفہ کا ایک مستقل عقیدہ بن گیا اور ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو عالم یا تعلیم یافتہ کہلانا چاہتا تھا۔ اُس کے لئے اس نظریہ کا قائل ہونا ضروری ہو گیا۔

لیکن سنہ ۱۸۴۶ء میں امریکہ میں وجودِ روح کے آثار و علامات نظر آئے جنھوں نے امریکہ سے گذر کر تمام یورپ کے خیالات میں تموج پیدا کر دیا اور لوگوں کو ایسے عالم روحانی کے وجود کا اقرار

کرنا پڑا جبیں بڑی بڑی عقلیں اور روشن افکار آباد ہیں تو اب مسائل روحانیہ میں بحث وفکر کا نقطہ نظر بھی بدل گیا۔ اور وحی کا مسئلہ از سر نو زندہ ہوگیا۔ علماء کے اس مسئلہ پر پھر بحث شروع کردی لیکن یہ ظاہر ہے کہ اُن کی یہ بحث کسی مذہبی جذبہ پر نہیں بلکہ علم تجربی کے قواعد پر قائم تھی۔ اس بنا پر ہمیں تعجب نہ کرنا چاہئے، اگر وہ وحی کے باب میں اُن نتائج وافکار تک نہیں پہونچ سکے جو علماء اسلام کے نزدیک مسلم ہیں۔ تاہم علماء مغرب کی تحقیق وتفتیش اور اُس کے نتائج واستنباطات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ وحی کو ہذیان محض، یا وہم وگمان سمجھتے تھے آخر کار اُن کو بھی اُسکی واقعیت وصداقت کا اقرار کرنا پڑا۔ ہم صرف یہی فرق دکھانے کے لئے ذیل میں علماء مغرب کے افکار ونظریات مختصراً قلمبند کرتے ہیں۔ ممکن ہے اس سے منکرینِ وحی کو کچھ تنبہ ہو اور وہ اپنے اصرار پر نظر ثانی کرنے کی زحمت گوارا کریں۔

مجالس تحقیق یورپ میں روح اور اُس کے اثرات کی تحقیق کی طرف بعض علماء کو توجہ ہوئی اور انھوں نے اپنے نتائجِ فکر شائع کئے تو تمام فضا میں ایک آگ سی لگ گئی۔ بمقام لندن ۱۸۸۲ء میں ایک کمیٹی بنی جس کا مقصد نفس اور اُس کے متعلقات پر بحث کرنا اور اُن کی تحقیق وجستجو کرنا تھا۔ اس کمیٹی میں جو علماء واساتذہ شریک تھے اُن میں قابل ذکر اور نمایاں تر یہ حضرات تھے۔

(۱) پروفیسر جیک کیمبرج یونیورسٹی	صدر کمیٹی، انگلستان کا مشہور عالم طبیعیات
(۲) پروفیسر سر اولیفر لودگ	علم طبیعیات کا ماہر خصوصی
(۳) سر ولیم کروکس	انگلستان کا مشہور عالم کیمسٹری
(۴) پروفیسر فرڈرک مائرس	کیمبرج یونیورسٹی
(۵) پروفیسر ہڈسن	"
(۶) پروفیسر ولیم جیمس ہرفورڈ یونیورسٹی امریکہ	

(۷) پروفیسر بلیز لوب   کولمبیا یونیورسٹی

(۸) کامیل فلامرین   فرانس کا ماہر مشہور فلکیات و ریاضیات

ان کے علاوہ یورپ کے مشہور علما رگار نئے، بار یٹ اور پوڈ مور بھی اس کمیٹی میں شریک تھے۔ یہ کمیٹی تقریباً تیس سال تک قائم رہی۔ اس مدت میں اُس نے ہزاروں روحانی واقعات و حوادث کی تحقیق کی اور نفسِ انسانی اُس کے قویٰ اور قوتِ ادراک سے متعلق بار بار تجربے کئے۔ جو چالیس ضخیم جلدوں میں مدون و محفوظ ہیں۔ اس کمیٹی نے اپنے نتائجِ فکر کی اشاعت کی تو انھوں نے ثابت کیا کہ انسان کے لئے ایک اور شخصیت بھی ہے۔ یعنی ہم اپنی موجودہ زندگی میں زندہ ہیں اور ادراک کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا یہ ادراک اُن تمام روحانی قوتوں کی وجہ سے نہیں ہوتا جو ہمارے اندر موجود ہیں بلکہ اُن روحانی قوتوں کے کسی ایک جزء سے ہوتا ہے جس کا اثر حواس خمسہ کے افعال کے ذریعہ ظاہر ہوتا رہتا ہے لیکن جو زندگی کہ ہم کو یہ حواس بخشتے ہیں، اس سے بھی کہیں زیادہ بڑھکر ایک اور زندگی ہے جس کی عظمت و جلالت کی کوئی نشانی اُس وقت تک ظاہر نہیں ہوتی جب تک کہ ہماری یہ ظاہری شخصیت نیند یا کسی اور ذریعہ سے معطل نہ ہوجائے، چنانچہ ہم نے اُن لوگوں پر جن کو مقناطیسی نیند کے ذریعہ سلا دیا گیا تھا۔ تجربہ کرکے دیکھا کہ سونے والے کو روحانی زندگی کی دولت فراواں حاصل ہوتی ہے اور وہ اس عالم میں اپنے حواسِ ظاہری کے علاوہ کسی اور حاسہ کے ذریعہ دیکھتا اور سنتا ہے۔ بعید چیزوں کی خبریں دیتا ہے اور اس وقت اُس کی قوتِ تعقل وادراک پورے طور پر بیدار ہوکر اپنا کام کرتی رہتی ہے۔

کمیٹی کے نزدیک یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی کہ انسان کی ظاہری شخصیت کے علاوہ ایک اور شخصیت ہے جو پہلی شخصیت سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور ارفع ہے۔ ان علما رنے یہ بھی معلوم کیا کہ یہی وہ اعلیٰ شخصیت ہے جس کے ذریعہ رحم میں جسم کا تکوّن ہوتا ہے اور جگر، قلب، اور معدہ وغیرہ

اعضا جن پر انسان کے ارادہ کو کوئی دسترس حاصل نہیں ہے اُن کی حرکت بھی اسی اعلیٰ شخصیت کی وجہ سے ہوتی ہی بلکہ حق یہ ہے کہ انسان کا انسان ہونا اسی شخصیت پر مبنی ہے۔ اُس شخصیتِ ظاہرہ پر نہیں جس کا قیام حواسِ خمسہ ظاہرہ کے ساتھ ہے اور یہی وہ شخصیت ہے جو جسم کے کثیف پردوں کے درمیان سے عمدہ عمدہ خیالات پیدا کرتی ہے۔ الہامات طیّبہ کا تعلق بھی اسی سے ہے اور یہی وہ قوت ہے جو انبیاء کے قلب میں اُن چیزوں کا القاء کرتی ہے جن کو اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی کہتے ہیں، پھر کبھی یہی وحی متجسم ہو کر نظر آتی ہے تو اس کو اللہ کے فرشتے کہتے ہیں جو آسمان سے نازل ہوتے ہیں[۱]۔

[۱] میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ علماءِ مغرب وحی کی جو حقیقت بیان کرتے ہیں وہ بعینہٖ وہی نہیں ہو جو علماءِ اسلام نے بیان کی ہے، لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ روح اور وحی و الہام کے تصور کو کھلی ہوئی گمراہی اور اُن کے اعتقاد کو وہم پرستی کہنے والے یورپ کے علماء محققین بھی عرصہ دراز کے غور و خوض کے بعد کس طرح ان چیزوں کی واقعیت کے قائل ہو گئے۔ اور اگرچہ انھوں نے ان چیزوں کی اصلی حقیقت کے بیان کرنے میں اسلامی نقطۂ نظر سے چند در چند غلطیاں کی ہیں لیکن پھر بھی حیرت کی بات ہے کہ ان علماء نے اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے وہ بعض علماءِ اسلام کے بیانات سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے اوپر جو تقریر نقل کی گئی ہے ایک طرف تم اسے پڑھو۔ اور دوسری جانب امام غزالی کی تقریر ذیل پر غور کرو جو انھوں نے وجود کی تین قسمیں وجود حسی۔ وجود عقلی اور وجود خیالی بیان کرنے کے بعد آخری قسم وجود خیالی کی تشریح میں کی ہے اور پھر دیکھو کہ امام صاحب کی یہ تقریر اور محققین یورپ کے نتائجِ فکر کس قدر ایک دوسرے سے ملتے جاتے ہیں امام صاحب فرماتے ہیں۔

"وجود خیالی یہ ہے کہ زبانِ حال تمثیلی رنگ میں محسوس اور مشاہد بن کر سامنے آئے۔ اور یہ خاص انبیاء اور پیغمبروں کی شان ہے اس کی مثال خواب کی ہے جس طرح خواب میں زبانِ حال پیغمبروں کے علاوہ عام آدمیوں کو بھی تمثیلی رنگ میں نظر آتی ہے، اور وہ آوازیں سنتے ہیں۔ مثلاً کوئی خواب دیکھتا ہے کہ اونٹ اُس سے باتیں کر رہا ہے یا گھوڑا اس کو خطاب کر رہا ہے۔ یا کوئی مردہ اس کو کچھ دے رہا ہے (بقیہ حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ پر)

ان علمائے محققین کی رائے ہے کہ یہ شخصیت باطنہ حس کے ذریعہ مدرک ہوتی ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ مقناطیسی نیند سوتے ہیں اُن میں پسندیدہ عقل، روشن فکر، نظرِ دوررس نفوس کے پوشیدہ اسرار میں اثر و نفوذ مخفی باتوں باتوں کو معلوم کر لینے کی صلاحیت و قابلیت اور اپنی حالتِ ظاہرہ کے اعتبار سے جاہل غبی ہونے کے باعث دنیا کے وسیع اقطار و اکناف میں سفر، یہ تمام چیزیں اس بات کی سب سے قوی دلیل ہیں کہ انسان کے لئے ایک ایسی باطنی شخصیت پائی جاتی ہے جو جسمانی حیات کے پردوں میں مستور رہتی ہے اور وہ اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جبکہ اُس کا جسم طبیعی یا صناعی نیند میں مصروف ہو۔

پھر رویائے صحیحہ بھی جو صبحِ روشن کی طرح وقوع پذیر ہوتا ہے اور جس کے ذریعہ انسان غیبی امور کو دریافت کر لیتا ہے یا جس میں وہ بعض اوقات ایسے ایسے مشکل مسائل حل کر لیتا ہے جنھیں وہ بیداری کی حالت میں حل نہیں کر سکتا تھا، یا جس میں بعض اوقات وہ ایسے اعمال کر گذرتا ہے جنکی بحالت بیداری

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) یا اُس کا ہاتھ پکڑ رہا ہے یا اُس سے چھینتا ہے یا یہ دیکھے کہ اُس کا ناخن شیر ہو گیا ہے، یا اسی قسم کی صورتیں جن کو لوگ خواب میں دیکھا کرتے ہیں، انبیاء علیہم السلام کو یہ چیزیں بیداری میں نظر آتی ہیں اور اسی بیداری کی حالت میں یہ چیزیں اُن سے خطاب کرتی ہیں۔ ایک جاگتا ہوا آدمی جس کو یہ چیزیں نظر آتی ہیں اور محسوس ہوتی ہیں وہ اس بات میں کچھ فرق نہیں کر سکتا کہ یہ خیالی گویائی ہے یا خارجی اور حسی ہے۔ خواب دیکھنے والے کو تو یہ فرق اس لئے محسوس ہو جاتا ہے کہ وہ جاگ اُٹھتا ہے اور خواب و بیداری دونوں کی حالتوں میں وہ فرق محسوس کرتا ہے۔ جن لوگوں کو ولایتِ تامہ حاصل ہوتی ہے اُن کو یہ تمثیلی رنگ تنہا نظر نہیں آتا بلکہ اس کا اثر عام حاضرین پر بھی پڑتا ہے، اس کی ولایت اپنے فیض کی شعاعیں ان پر ڈالتی ہے اور وہ بھی وہی دیکھتے ہیں جو صاحبِ ولایت کو نظر آتا ہے۔ اور وہی سنتے ہیں جو صاحبِ ولایت کو سنائی دیتا ہے۔

(مضمون بہ علیٰ غیر اہلہ صفحہ ۱۹ مطبوعہ مصر بحوالہ سیرۃ النبی ج ۳ ص ۳۰)

وہ کبھی ہمت بھی نہیں کرسکتا تھا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کے لئے اُس کی ظاہری شخصیت کے علاوہ ایک اور باطنی شخصیت ہے جو پہلی سے کہیں زیادہ بلند اور ترقی یافتہ ہے۔

ان استدلات کے علاوہ اور بھی متعدد امور ہیں جن کا اس تحقیقاتی انجمن نے نہایت دقیقہ رسی کے ساتھ عمیق مطالعہ کیا۔ پھر ساتھ ہی ان تجربوں کا جائزہ لیا جو ان سے پہلے کئے جا چکے تھے۔ اور آخر کار انھوں نے عالمِ روح اور اُس کے لطائف و مزایا کا کھلے دل سے اقرار کرلیا۔ اس سلسلہ میں کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور ماہر علم النفس پروفیسر ڈاکٹر مائرس (Myers) نے جو اس انجمن کے بھی رکن خصوصی تھے انسانی شخصیت (Human Personality) پر ایک نہایت قابلِ قدر کتاب لکھی ہے جس کے متعدد ابواب میں مقناطیسی نیند عبقریت، وحی، اور شخصیت باطنیہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ہم ذیل میں چند اقتباسات کتاب مذکور کے صفحہ ۷۷ اور اس کے بعد کے صفحات سے نقل کرتے ہیں۔

پروفیسر مائرس نے سب سے پہلے اُن ریاضی دانوں کا ذکر کیا ہے جو مشکل سے مشکل مسائلِ ریاضی کا درست حل فوراً بغیر کسی غور و فکر کے معلوم کرسکتے ہیں پھر لطف یہ ہے کہ اگر ان سے پوچھا جائے کہ تمہیں یہ جواب کیونکر معلوم ہوا تو وہ بجز اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہمیں معلوم نہیں، اس سلسلہ میں پروفیسر موصوف نے بیدلر نامی ایک شخص کا ذکر کیا ہے جو بڑے سے بڑے عدد کے متعلق یہ بتا سکتا تھا کہ وہ کن اعداد کی ضرب سے حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ اُس سے پوچھا گیا کہ وہ کیا کیا اعداد ہیں جن کو ضرب دیا جائے تو ۱۷۸۶۱ کا عدد حاصل ہو جائے، تو اُس نے غور و تامل کے بغیر فوراً کہا کہ ۳۷ کو ۴۸۳ میں ضرب دیا جائے تو نتیجہ میں یہ عدد پیدا ہوتا ہے۔ پھر اُس سے پوچھا گیا کہ کس قاعدہ اور حساب سے؟ اُس نے کہا، میں اس سے واقف نہیں، گویا اُس کا یہ جواب ایک طرح کا طبعی اقتضا تھا جس میں انسان کے ارادہ اور فہم کو دخل نہیں ہوتا۔

مسٹر سکر ٹیشر نے مطران وائلی سے نقل کیا ہے کہ اُس نے ایک مرتبہ خود اپنی نسبت بیان کیا کہ جب میں پانچ چھ برس کی عمر کا تھا تو میں جمع و تفریق کے سوالات کسی کاغذ پر لکھے بغیر زبانی ہی بہت جلد حل کر دیا کرتا تھا۔ میری یہ حالت تین سال تک رہی مگر تعجب کی بات ہے کہ جب میں بڑا ہوا اور اسکول میں داخل ہو کر باقاعدہ ریاضی کا پڑھنا شروع کر دیا تو میرا یہ خصوصی امتیاز یا ریاضیات کے ساتھ طبعی مناسبت و فراست تدریجی طور پر کم ہونے لگی۔ یہاں تک کہ اب میں ریاضی کا ایک بہت ہی کمزور طالب علم ہوں، اس موقع پر ایک اور واقعہ کا ذکر کرنا مناسب نہ ہوگا جو مولانا عبدالباری ندوی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

"تریکون متی (Trignometry) یا مساحۃ المثلثات وغیرہ ریاضیات عالیہ کی وہ شاخیں ہیں جن کی کالجوں میں ریاضیات کے اعلیٰ مدارج میں تعلیم دی جاتی ہے، ۱۰، ۱۱ برس کے بچے جو علی العموم زیادہ سے زیادہ سکول کی چوتھی پانچویں جماعت میں پڑھتے ہیں۔ اُن کی ریاضی دانی بس حساب کے چند ابتدائی قواعد تک محدود ہوتی ہے، جو لڑکے غیر معمولی طور پر ذہین و محنتی ہوتے ہیں اور جن کی تعلیم کا گھر پر معلم رکھ کر کچھ خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ وہ بہت ترقی کرتے ہیں تو ۱۳-۱۴ برس کی عمر میں اسکول کی تعلیم پوری کر لیتے ہیں۔

لیکن گذشتہ سال اکتوبر میں (۷، اکتا ار۔ لیڈر اخبار) راج نرائن نامی ۱۱ برس کے ایک مدراسی لڑکے کا "معجزہ ریاضیات" (اسی عنوان سے) یہ چھپا تھا کہ اس نے بلا کسی معلم کی مدد کے اعلیٰ الجبرا، تریکون متی، تحلیلی اقلیدس (جومیٹری) وغیرہ از خود حاصل کی ہو (سیرۃ النبی ج ۳ ص ۱۳۹)

پروفیسر مائرس نے "الہامی طور پر" ریاضی جاننے والوں کا تذکرہ کرنے کے بعد چند شعراء اور دوسرے لوگوں کا ذکر کیا ہے اور بعض خواب کے عجیب و غریب واقعات بیان کئے ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

"میں یقین کرتا ہوں کہ اس قسم کے واقعات دنیا میں پہلی مرتبہ ہی ظاہر نہیں ہوئے۔ بلکہ اس سے پہلے بھی لوگوں کے علم میں آچکے ہیں۔ یہ سب ہمارے شعورِ باطنی کے کرشمے ہیں جو ہر دور اور ہر زمانہ میں موجود رہتا ہے" پھر آخر میں کہتے ہیں۔

"اب میں پورے وثوق اور جزم و اذعان کے ساتھ کہتا ہوں کہ انسان میں ایک روح کا وجود یقینی ہے جو اپنے لئے قوت اور جمال کا اکتساب عالم روحانی سے کرتی ہے۔ اور ساتھ ہی میں اس بات کا بھی یقین رکھتا ہوں کہ تمام عالم میں ایک روحِ کبیر سرایت کئے ہوئے ہے جس کے ساتھ انسانی روح کو اتصال حاصل ہو سکتا ہے"

اپنی اس تحقیق کے ساتھ ہی مائرس نے فرانس کے مشہور پروفیسر ریبو سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ:۔

"انسان کی باطنی شخصیت ہی وہ چیز ہے جس کو عام لوگ وحی کہتے ہیں۔ اس حالت کے لئے طبعی صفات و خصائص ہیں جو اُس کے ساتھ ہی مختص ہیں، یہ باطنی شخصیت ہر چیز سے مقدم ہے اور یہ نہ کسی شخص کے سامنے جھکتی ہے اور نہ انسانی ارادہ کے تابع ہے جس وقت یہ عمل کرتی ہے تو اس طرح کرتی ہے کہ گویا وہ انسان کی کوئی صفتِ غریزیہ و فطریہ ہے۔ اس باطنی شخصیت سے مدد طلب کی جاسکتی ہے لیکن اس پر کوئی جبر نہیں کیا جاسکتا"[۱]

علامہ فرید وجدی نے دائرۃ المعارف کی جلد رابع میں لفظ روح کے ماتحت ایک نہایت مبسوط و مفصل اور جامع مقالہ لکھا ہے جس میں انھوں نے اسپرٹزم (روحانیت)، کی تاریخ، محققین یورپ و امریکہ کی تحقیقاتی انجمنیں، ان انجمنوں کی رپورٹیں، مشہور محققین کے جستہ جستہ اقوال بیان کئے ہیں اور اسی سلسلہ میں اُنھوں نے ۵۱ علماء تحقیق کے ناموں کی ایک منتخب فہرست دی ہے جو روح کے وجود اور اُس کے لطائف و مزایا کا حتمی طور پر یقین رکھتے تھے۔ ان کا مختصر تذکرہ بھی

[۱] اس حصہ کی اکثر معلومات دائرۃ المعارف فرید وجدی بک کی جلد ۱۰ لفظ وحی سے ماخوذ ہیں۔

طوالت کا باعث ہوگا۔ اس لئے آخر میں ہم صرف رسل ویلز کی شہادت پر اکتفا کرتے ہیں جو اُسنے روح اور اُس کے عجائبات کے باب میں قلم بند کی ہے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ رسل ویلز طبیعیات میں ڈارون کا ہم پلہ اور اُس کا شریک خیال کیا جاتا ہے، اُس نے عجائباتِ روح پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں وہ ان الفاظ میں برملا اعتراف کرتا ہے۔

"میں کھلا ہوا دہریہ اور مادہ پرست تھا۔ میرے ذہن میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آسکتا تھا کہ میں کسی وقت روحانی زندگی کا اظہار کروں گا یا مادہ اور اُس کی قوت کے سوا ایسے وجود کی تصدیق کروں گا جو اس دنیا میں کارفرما ہے۔ مگر میں کیا کروں؛ میں نے پے بہ پے ایسے محسوس مشاہدات کئے جن کو نہیں جھٹلایا جاسکتا تھا۔ اُنھوں نے مجھ کو مجبور کر دیا کہ میں ان چیزوں کو حقیقی اور واقعی تسلیم کروں۔ اگرچہ ایک مدت تک میں یہ تسلیم نہیں کرتا تھا کہ یہ آثار روح سے سرزد ہوتے ہیں، لیکن ان مشاہدات نے رفتہ رفتہ میری عقل کو متاثر کرنا شروع کر دیا، نہ بطریق استدلال وحجت، بلکہ یہ مشاہدات کے پیہم تواتر کا اثر تھا جس سے میں بجز روح کے اعتراف کے کسی اور طریقہ سے بچ ہی نہیں سکتا تھا۔"

یورپ کے اساتذہ علوم جدیدہ نے روح کے متعلق جو تحقیقات کی ہیں اُن سے وہ ان نتائج پر پہونچے ہیں جو کیمل فلامریان کے نزدیک حسب ذیل ہیں۔

(۱) روح جسم سے جداگانہ ایک وجودِ مستقل رکھتی ہے۔

(۲) روح میں اس قسم کی خاصیتیں ہیں جو اب تک علوم جدیدہ کی رو سے غیر معلوم تھیں۔

(۳) روح حواس کی وساطت کے بغیر متاثر ہوسکتی ہے یا دوسری چیز پر اپنا اثر ڈال سکتی ہے

(۴) روح آئندہ واقعات سے واقف ہوسکتی ہے۔

پھر اس روشنی میں وحی کی نسبت ان علماء کا جو خیال ہے وہ یہ ہے کہ وحی دراصل روح

انسانی پر ایک خاص قسم کی تجلی کا نام ہے جو اُس پر اُس کی شخصیت باطنہ کے ذریعہ ضَو فگن ہوتی ہے اور اُس کو وہ باتیں سکھاتی ہے جنھیں وہ پہلے سے نہیں جانتا تھا۔ اور اُس کو ایسے امور کی طرف ہدایت دیتی ہے جن میں خود اسکی بھلائی اور اُس کی اُمت کی ترقی کا راز پنہاں ہوتا ہے[۱]

وحی کے باب میں علماء اسلام اور ان علماء یورپ میں اتنی بات تو مشترک ہے کہ وحی کا تعلق جسم یا کسی جسمانی طاقت سے نہیں بلکہ روح سے ہے۔ اور یہ انسان کے ارادہ کے تابع نہیں۔ البتہ یہ امر مختلف فیہ ہے کہ اسلام میں وحی فرشتہ کے ذریعہ نبی کے قلب پر اُترتی ہے اور ان لوگوں کے نزدیک جس کو فرشتہ کہتے ہیں وہ دراصل انسان کی ہی شخصیتِ باطنہ ہے جو متشکل ہو کر اُس کے سامنے آجاتی ہے۔ لیکن یہ بھی کیا کم ہے کہ ان لوگوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ ایک روحِ اعظم ہے جو تمام کائنات میں ساری ہے اور انسانوں کی خاص خاص ارواح کو اُس کے ساتھ ایک ایسا علاقہ ہوتا ہے جس کے باعث اُس سے خارقِ عادات امور صادر ہوتے ہیں اور اُسپر وحی نازل ہوتی ہے۔ پھر یہ علاقہ کی کمی بیشی کا دارو مدار انسانی روح کی ذاتی استعداد پر ہے۔

اب ذرا غور کیجئے کہ ان محققینِ یورپ کے الفاظ میں خدا کا اور جبرئیل امین کا کہیں نام نہیں آیا ہے لیکن اگر ذرا تغیر و تبدل کر دیا جائے تو یہ بے تامل کہا جا سکتا ہے۔

عباراتنا شتّٰی وحُسنُك واحدٌ

---

[۱] دائرۃ المعارف ج ۲۰ ص ۷۱۹

تسلسلِ وحی اور نزولِ جبریل

پہلی وحی کے بعد جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، وحی کچھ دنوں کیلئے آنی بند ہوگئی۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں۔ "اس میں مصلحت یہ تھی کہ پہلی وحی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو دہشت ہوئی تھی وہ جاتی رہے، آپ رفتہ رفتہ اُس کو برداشت کرنے کے عادی ہو جائیں اور آپ کو اُس کے دوبارہ دیکھنے کا اشتیاق بھی پیدا ہو جائے[۱]۔

فترتِ وحی یعنی وحی رُک جانے کی مدت میں اختلاف ہے۔ حافظ ابن حجر نے تاریخ امام احمد حنبلی سے بروایت شعبی نقل کیا ہے کہ یہ مدت تین برس تھی بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ڈھائی سال تھی لیکن ابن سعد نے حضرت ابن عباس کی روایت نقل کی ہے کہ "فترت کی مدت چند روز تھی۔ یہی غالباً صحیح ہے۔

آنحضرت صلعم کا حزن و ملال | وحی کے رُک جانے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا رنج و ملال ہوا[۲]

---

[۱] فتح الباری ج ۱ ص ۲۲ جدید اڈیشن

[۲] بعض روایتوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انقطاعِ وحی کا سخت رنج و قلق ہوا اور ادھر کفار نابکار نے طعن و طنز شروع کر دیا تو اس پر سورہٴ والضحیٰ کی یہ آیات نازل ہوئیں۔

والضحیٰ واللیل اذا سجیٰ ما ودّعک ربّک وما قلیٰ

قسم ہے وقت چاشت کی اور قسم ہے رات کی جبکہ وہ ساکن ہوگئی ہو۔ آپ کے رب نے نہ آپ کو چھوڑا ہے اور نہ اُس نے دشمنی کی ہے

(الضحیٰ پارہ ۳۰ آیات ۱ تا ۳)

صحیح بخاری کتاب التعبیر میں حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

وفتر الوحی فترۃً حتی حزن النبی	اور وحی کا آنا رک گیا۔ یہاں تک کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم فیما بلغنا	صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسا کہ ہم کو اطلاع ہوئی ہے
حزنا غدا منہ مرارا کی یتردی	اس کا غم ہوا۔ آپ کئی مرتبہ گھر سے روانہ ہوئے
من رؤس شواہق الجبال	کہ اپنے آپکو پہاڑ کی چوٹیوں سے گرادیں لیکن جب
فکلما اوفی بذروۃ جبل لکی	کبھی آپ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتے تھے تاکہ اپنے
یلقی منہ نفسہ تبدی لہ جبریل	آپکو گرادیں تو جبریل ظاہر ہوتے تھے اور کہتے
فقال یا محمد انک رسول اللہ	تھے اے محمد! آپ سچ مچ اللہ کے رسول ہیں
حقا فیسکن لذالک جاشہ وتقر	یہ سن کر آپ کا قلب سکون پذیر ہوجاتا تھا۔
نفسہ فیرجع فاذا طالت علیہ	اور آپ لوٹ جاتے تھے۔ پھر جب وحی کی رکاوٹ
فترۃ الوحی غدا لمثل ذالک فاذا	طویل ہوگئی تو آپ پھر ایسا کرتے کہ پہاڑ کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) لیکن ہماری رائے میں یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ تمام محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ فترۃ الوحی کے بعد سب سے پہلے سورہ مدثر کی آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ اب اگر سورہ والضحیٰ کا نزول سورہ مدثر کی آیتوں کے بعد مانا جائے تو پھر نزول وحی کے جاری ہونے کے بعد ما ودعک فرماکر کفار کی تردید کرنا شانِ نزول کے ساتھ زیادہ چسپاں نہیں ہوتا اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ سورہ مدثر کے نزول تک تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا اعلان ہی نہیں کیا تھا۔ اس لئے وحی کے رک جانے پر کفار کے طعن وطنز کے کوئی معنی نہیں۔ اس بنا پر اس سورۃ کے شان نزول سے متعلق وہی روایت صحیح ہے جس کو امام بخاری نے تفسیر سورہ والضحیٰ اور باب کیف نزل الوحی میں نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ آپ بیمار تھے چند روز راتوں کو اٹھ کر عبادتِ الٰہی میں مصروف نہ ہوسکے تو ایک ہمسایہ عورت نے آپ کی شانِ فلک نشان میں سخت گستاخانہ کلمات کہے۔ ان کلمات کی تردید میں یہ سورۃ نازل ہوئی۔

اوفی بذروۃ جبل تبدّی لہ	چوٹی پر پہونچتے تھے۔ اس وقت بھی جبریل ظاہر
جبریلؑ فقال لہٗ مثل ذالک	ہوتے اور آپ سے وہی فرماتے تھے

فترۃ الوحی کے بعد آپ پر جو وحی نازل ہوئی اُس کا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں تو تشریف لے جاتے رہتے ہی تھے۔ ایک دن آپ حرا[1] سے واپس تشریف لا رہے تھے کہ ناگاہ ایک صدائے غیب سنائی دی جو آسمان سے آ رہی تھی۔ آپ نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو وہی فرشتہ تھا جو حرا میں آیا تھا۔ یہ فرشتہ اس وقت آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرشتہ کو اس طرح دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے اور گھر واپس آکر فرمایا "مجھے کمل اُڑھادو" اسی حالت میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

یَا اَیُّھَا المدثّر قُم فانذِر وَ رَبّک	اے گلیم پوش! اُٹھ اور لوگوں کو ڈرا اور اپنے
فکبّر و ثیابک فطھّر والرّجز	رب کی کبریائی بیان کر اور اپنے کپڑے پاک
فاھجُر[2]	رکھ اور ناپاکی کو دور کر

اس کے بعد وحی کا سلسلہ برابر جاری رہا اور اس کا تار اُس وقت تک نہیں ٹوٹا جب تک کہ آپ اس عالم ناپائدار سے روپوش نہیں ہو گئے "فحمی الوحی و تتابع"

حضرت ابن عباس سے ایک روایت ہے کہ آخری آیتِ قرآن جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے نو یا سات دن پہلے نازل ہوئی سورۂ بقرۃ کی یہ آیت ہے۔

واتقوا یومًا تُرجعون فیہ اِلیٰ اللّٰہ	اور ڈرو اُس دن سے جس میں تم اللہ کی طرف
ثُمّ تُوفّی کلُّ نفسٍ ما کسبت وھُم	لوٹ جاؤگے، پھر ہر شخص کو اُس کے عمل کے مطابق
لا یُظلمون	بدلہ دیا جائے گا اور اُن پر ظلم نہ ہوگا۔

[1] حرا مکہ معظمہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے

[2] صحیح بخاری باب بدء الوحی

حضرت ابن عباس سے ہی ایک دوسری روایت ہے کہ یہ نہیں بلکہ آیت ربا آخری آیت ہے۔ واللہ اعلم (تفسیر خازن ج ا مطبوعہ مصر ص ۲۰۵)

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع شروع میں نزول وحی کے وقت شدت کا احساس ہوتا تھا اور پھر بربنار بشریت آپ کو وحی کے بھول جانے کا بھی اندیشہ تھا۔ اس لئے آپ نزول وحی کے وقت اپنے لبوں کو جلد جلد حرکت دیتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ ان علینا جمعہ وقرانہ (القیامۃ)

آپ اپنی زبان کو حرکت نہ دیجئے کہ آپ اس کے ساتھ عجلت کریں۔ بے شبہ قرآن کا آپ کے سینہ میں جمع کرنا اور اس کا پڑھانا ہمارا ذمہ ہے

حضرت ابن عباس سے صحیح بخاری میں روایت ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ جب جبریل آتے تھے تو آپ بالکل خاموش ہو کر سنتے تھے، پھر جب جبریل چلے جاتے تو آپ اس وحی کو اسی طرح پڑھتے تھے جس طرح کہ جبریل پڑھ کر سناتے تھے۔ حضرت انس سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آخر عمر میں وحی کی کثرت ہو گئی تھی[1]۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آخر عمر میں مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ اطراف ملک سے وفود کی آمد کا سلسلہ جاری تھا؛ احکام اور لوگوں کے استفسارات بڑھ گئے تھے۔

پہلی وحی اس وقت آئی جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سن مبارک چالیس سال تھا جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے اس کے بعد کچھ مدت کے لئے وحی کا آنا رک گیا پھر سلسلہ شروع ہوا تو آخیر عمر تک جاری رہا۔ آپ کی وفات ۶۳ سال کی عمر میں ہوئی ہے اس بنا پر وحی کی مدت ۲۳ سال ہے۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے شروع شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرشتہ وحی کے دیکھنے

[1] صحیح بخاری باب کیف نزل الوحی

سے دہشت ہوتی تھی لیکن بعد میں جب آپ اُن سے مانوس ہو گئے تو پھر آپ کے شوق و اشتیاق کا یہ عالم ہو گیا کہ اگر کبھی فرشتۂ وحی کے آنے میں کچھ دنوں کی تاخیر و تعویق ہو جاتی تو آپ مضطرب ہو جاتے تھے

چنانچہ صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل سے فرمایا کہ تم اس سے بھی زیادہ میرے پاس کیوں نہیں آتے ؟ اُس کے جواب میں حضرت جبریل کی زبانی ارشاد فرمایا گیا۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ	اور ہم تو آپ کے پروردگار کے حکم اور اجازت
لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا	سے اُترتے ہیں اُس کو اُن تمام چیزوں کا علم ہے
وَمَا بَيْنَ ذَٰلِكَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ	جو ہمارے آگے پیچھے اور اُس کے درمیان ہیں
نَسِيًّا (مریم)	اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں ہے۔

بارگاہِ نبوی میں حضرت جبریل کی آمد کا کوئی وقت متعین نہیں تھا صبح شام، دن اور رات جب خدا کا حکم ہوتا وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر خدا کا پیغام پہونچاتے تھے : تاہم جس طرح بارش ہونے والی ہوتی ہے تو اُس کے آثار و علامات پہلے سے فضا میں محسوس ہونے لگتے ہیں۔ وحی کے نزول یا آمد جبریل کا وقت قریب ہوتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے ہی یہ بات محسوس ہو جاتی تھی اور آپ بے چینی سے اس کا انتظار شروع کر دیتے تھے۔ آپ کی یہ حالت ایسی واضح اور ظاہر ہوتی تھی کہ اگر اُس وقت کوئی شخص آپ کے پاس ہوتا تو وہ بھی اُس کو محسوس کر لیتا تھا۔

حضرت ابوذر غفاری کا بیان ہے کہ میں ایک شب میں باہر نکلا تو دیکھا کہ سید ولد آدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا چل رہے ہیں اور آپ کے ساتھ کوئی شخص بھی نہیں ہے میں نے خیال کیا کہ غالباً اس وقت آپ کسی کی معیت پسند نہیں کرتے اس لئے میں چاندنی میں چلنے لگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میں نظر آیا۔ آپ نے پوچھا " کون "؟ میں نے عرض کی " ابوذر "! میں

آپ پر قربان ہوں" ارشاد ہوا "اے ابوذر! ذرا آؤ تو" میں اس ارشادِ گرامی کے مطابق تھوڑی سی دور چلا تھا کہ زبانِ نبوت یوں گوہر بار ہوئی " جو اربابِ ثروت ہیں وہی قیامت میں کنگال ہونگے" مگر ہاں وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن کو اللہ نے مال دیا اور انھوں نے اُس کو دائیں بائیں، آگے اور پیچھے بکھیر دیا اور اُس میں نیکی کے کام کئے۔ ابوذر کا بیان ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کچھ دیر تک ہی چلا تھا کہ آنحضرت نے فرمایا" تم یہاں بیٹھ جاؤ، یہ فرماکر آپ نے مجھ کو ایسے میدان میں بٹھا دیا جس کے ارد گرد پتھر پڑے ہوئے تھے۔ پھر فرمایا" دیکھنا تم یہاں بیٹھے رہنا یہاں تک کہ میں واپس آؤں" اس کے بعد آپ حرہ[1] کی طرف تشریف لے گئے۔ یہاں تک کہ میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔ آپ دیر تک وہاں ٹھہرے رہے، پھر جب آپ آ رہے تھے تو میں نے سنا کہ آپ فرما رہے تھے" اگرچہ وہ چوری کرے یا زنا کرے" جب آپ آگئے تو مجھ سے صبر نہیں ہوسکا اور میں پوچھ ہی بیٹھا" اے اللہ کے نبی! میں آپ پر قربان ہو جاؤں، آپ حرہ کی سمت میں کس سے باتیں کر رہے تھے، میں نے تو کسی کی آواز نہیں سنی کہ وہ آپ کی بات کا کوئی جواب دیتا" ارشاد ہوا" یہ جبرئیل تھے جو حرہ کے پہلو میں میرے سامنے آئے اور انھوں نے کہا کہ آپ اپنی اُمت کو خوشخبری سنا دیجئے کہ جس شخص کا انتقال اس حالت میں ہوگیا کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتا تھا، وہ جنت میں داخل ہوگا۔ میں نے پوچھا" اگرچہ وہ سرقہ یا زنا کرے" جبرئیل نے جواب دیا" ہاں! اگرچہ وہ سرقہ یا زنا کا مرتکب ہو، میں نے پھر دوبارہ یہی سوال کیا تو جبرئیل نے پھر یہی جواب دیا[2]

حضرتِ عائشہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ آپ نصف شب کو سو رہے تھے کہ اُٹھ کر بقیع کے

---

[1] مدینہ منورہ کی شمالی جانب میں ایک مقام کا نام ہے جہاں یزید بن معاویہ کے زمانہ میں مشہور واقعہ قتل و قتال ہوا تھا۔ اور جس میں اہل مدینہ پر لرزہ فگن مظالم کئے گئے تھے۔

[2] صحیح بخاری کتاب الرقاق

قبرستان میں تشریف لے گئے۔ صبح کو آپ نے فرمایا، رات جبریل نے مجھ کو پیغام دیا کہ میں اس وقت بقیع میں جاکر دعاء مغفرت کروں[1]،،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ہر ہر ادا، اور آپ کا ہر ہر فعل خدا کے حکم اور اس کے ارشاد کے مطابق ہوتا تھا۔ اس بنا پر اگر کبھی آپ سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوتا جو منشاء خداوندی کے مطابق نہیں ہوتا تھا تو فوراً جبریل امین آکر اس کی اصلاح کر دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ خندق سے مسلمانوں کی فوج لیکر واپس آئے اور ہتھیار رکھو لکر غسل فرمایا تو جبریل نے آکر کہا،، آپ نے ہتھیار کھول دیئے حالانکہ ہم اب تک ہتھیار بند ہیں اور بنو قریظہ کو ابھی ان کی غداری کا بدلہ دینا ہے[2]،،

حضرت جبریل اگرچہ عموماً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تنہائی میں آتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی اس وقت بھی آتے تھے جب آپ کے پاس مجمع ہوتا تھا یا ایک دو اصحاب بیٹھے ہوتے تھے اس مضمون کی کئی ایک روایات پہلے گذر چکی ہیں، ایک مرتبہ آپ ام المومنین حضرت عائشہ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ آپ نے فرمایا،، اے عائشہ! جبریل تم پر سلام بھیجتے ہیں،، ام المومنین بولیں ،، یا رسول اللہ! آپ وہ دیکھتے ہیں جو میں نہیں دیکھتی،، ایک دفعہ آپ نے غزوۂ بدر میں فرمایا ،، دیکھو! یہ جبریل اپنے گھوڑے کی لگام تھامے کھڑے ہیں[3]،،

رمضان میں جبریل کی آمد زیادہ ہوتی تھی۔ اس ماہ مبارک میں وہ ہر روز آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید سنتے تھے اور آپ کو سناتے تھے۔

وحی غیر متلو | یہ بات یقینی ہے کہ حضرت جبریل بعض اوقات خدا کی طرف سے ایسے پیغامات بھی لیکر آتے تھے جو قرآن مجید میں موجود نہیں ہیں، اسی بنا پر علماء اسلام نے وحی کی دو قسمیں کر دی ہیں

---

[1] نسائی باب الاستغفار للمومنین [2] بخاری باب غزوۂ خندق [3] بخاری غزوۂ بدر

ایک متلو اور دوسری غیر متلو، وحی متلو تو وہی ہے جو قرآن مجید کی صورت میں مسلمانوں کے سینوں میں اور سفینوں میں محفوظ ہے۔ دوسری قسم وحی غیر متلو وہ ہے جو احادیث صحیحہ کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے خود قرآن مجید کی تصریح

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ — اور آنحضرت اپنی خواہش سے نہیں بولتے ہیں بلکہ
إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (النجم) — آپکا نطق وہ وحی ہوتا ہے جو آپ پر بھیجی جاتی ہے

کے مطابق وہ بھی وحی ہی ہے اور ہمارے لئے سرچشمۂ سعادت و فلاح ہے۔ چونکہ احکام و مسائل کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے تھے وحی سے فرماتے تھے۔ اس بنا پر اگر کوئی شخص آپ سے کوئی حکم دریافت کرتا اور وہ آپ کو معلوم نہ ہوتا تو آپ جواب میں خاموش رہتے اور وحی کا انتظار فرماتے تھے، یعلیٰ بن امیہؓ کا بیان ہے کہ حجۃ الوداع[1] کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ میں قیام پذیر تھے کہ ایک شخص نے آکر سوال کیا یا رسول اللہ! آپ اس شخص کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں جس نے کپڑے میں خوشبو مل لینے کے بعد احرام کی نیت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قدر انتظار کیا، یہاں تک کہ آپ پر نزولِ وحی کی کیفیت طاری ہوئی، جب وہ کیفیت زائل ہوگئی تو آپ نے اس سائل کو بلوایا وہ آگیا تو آپ نے فرمایا، "جو خوشبو تم مل چکے ہو اس کو تین دفعہ دھوڈالو اور اس کپڑے کو اتار دو، پھر عمرہ ادا کرو۔

ایک مرتبہ ایک یہودی عالم نے آپ سے پوچھا "بہترین جگہ کون سی ہوتی ہے؟" آپ خاموش رہے اور پھر فرمایا "میں جبرئیل کے آنے تک خاموش رہوں گا" چنانچہ جب جبرئیل آئے تو آپ نے ان سے پوچھا "بہترین جگہ کونسی ہوتی ہے" جبرئیل نے کہا "اس مسئلہ میں تو سائل اور مسئول منہ یعنی آپ اور میں دونوں برابر ہیں، لیکن ہاں میں اپنے رب سے سوال کرونگا۔ پھر جبرئیل (دوبارہ آئے)

---

[1] یہ روایت اس کتاب میں پہلے بھی ایک جگہ گزر چکی ہے۔

اور انھوں نے کہا، اے محمد! میں اللہ سے اتنا قریب ہو گیا تھا کہ ایسا قریب کبھی نہیں ہوا تھا۔ آنحضرتؐ نے پوچھا، "یہ کیونکر ہوا؟" وہ بولے "میرے اور خدا کے درمیان نور کے ایک ہزار پردے حائل تھے، اللہ نے فرمایا، "بدترین جگہ بازار ہیں اور بہترین جگہ مسجدیں ہیں۔

(صحیح ابن حبان ج ۱ ص ۱۷ مطبوعہ مجتبائی پریس دہلی)

وحی متلو اور غیر متلو دونوں میں حکم کے اعتبار سے فرق یہ ہے کہ وحی متلو یعنی قرآن مجید کا ایک ایک حرف متواتراً منقول ہے اور اس لئے وہ بالکل قطعی اور حتمی طور پر خدا کا کلام ہے۔ لیکن اس کے برعکس وحی غیر متلو یعنی احادیث احکام و مسائل کا یہ حال نہیں ہے۔ ان کا بہت کم حصہ متواتر منقول ہے پھر جو متواتراً منقول ہیں، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بھی الفاظ کو خدا کے الفاظ نہیں بتایا، اس لئے وہ معنیً تو ارشاد خداوندی ہیں لیکن لفظاً نہیں۔

قرآن مجید وحی الٰہی کیوں ہے؟

گذشتہ مباحث کے بعد آخر میں ایک سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ قرآن مجید وحی الٰہی کیوں ہے؟ اس کے کیا دلائل ہیں؟ اور وہ کون سے خصائص و اوصاف ہیں جن کی بنا پر قرآن کلام بشر نہیں بلکہ کلام الٰہی ہے؟ اس سوال کا ایک واضح اور کھلا جواب تو یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات جو پیغمبری کے تمام خصائص و محامد کی جامع ہے۔ قرآن کے وحی الٰہی ہونے کی سب سے بڑی اور روشن دلیل ہے۔ گذشتہ ابواب میں ضمنی طور پر اس کی طرف متعدد جگہ اشارات ملیں گے۔ ہم یہاں قرآن کی صرف حیثیتِ کلام کو پیش نظر رکھ کر گفتگو کرتے ہیں۔

وصفِ اعجاز قرآن کے بیشمار خصائص کے لئے ایک جامع لفظ اعجاز ہے یعنی قرآن مجید اپنے اعجاز کے سبب کلام الٰہی ہے جس طرح کسی جاندار چیز کا پیدا کرنا۔ اور پھر مار ڈالنا۔ آسمان سے پانی کا برسنا اور پھر بادلوں کا کھل جانا۔ مشرق سے آفتاب کا طلوع ہونا اور پھر غروب ہو جانا، ہوا کا چلنا اور تھمنا۔ یہ سب چیزیں انسان کے دسترس اور قابو سے باہر ہیں اور اس لئے یہ سب ایک زبردست قوت کے وجود کی دلیل ہیں جو اپنی قدرت و حکمت سے اس کارگاہ ہست و بود کو انتہائی نظم و انتظام کے ساتھ چلا رہی ہے اسی طرح قرآن کا معجز نما ہونا یعنی انسانوں کا اُس جیسا کلام لانے سے عاجز رہنا اُس کے وحی الٰہی ہونے کی بین دلیل ہے۔

وجوہِ اعجاز لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن کا یہ اعجاز کس وصف کے لحاظ سے ہے؟ علماء اسلام نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس سوال کے متعدد جوابات دیئے ہیں جن کو مختصراً اس طرح

بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) قرآن مجید کا نظم کلام اور اسلوب ادا معجز ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عرب کے کلام نثر کے لئے جتنے اسالیب مقرر تھے۔ قرآن مجید نے اُن سب سے الگ ایک نیا اسلوب اختیار کیا ہے جس کا مثل لانا انسان کے حیطۂ قدرت سے باہر ہے یہ مسلک معتزلہ کی ایک بڑی جماعت کا ہے۔

(۲) اشاعرہ قرآن مجید کا اعجاز فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے مانتے ہیں یعنی وہ کہتے ہیں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا فصیح و بلیغ متکلم بھی قرآن جیسا فصیح و بلیغ کلام نہیں بول سکتا۔

(۳) بعض متکلمین کے نزدیک قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ وہ ایک نبی امی کی زبان سے ادا ہو۔

(۴) بعضوں کی رائے یہ ہے کہ قرآن مجید میں گذشتہ اقوام و ملل کے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں اور بعض آیندہ واقعات کے بارہ میں جو پیش گوئیاں کی گئی ہیں اور وہ سب حرف بحرف پوری ہوئی ہیں قرآن اُن کے لحاظ سے معجز ہے۔

(۵) بعض علماء کہتے ہیں کہ قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ وہ شروع سے آخر تک ایک ہی اسلوب اور ایک ہی اسٹائل میں ہے۔ اُس میں رفع و خفض اور نشیب و فراز بالکل نہیں پایا جاتا۔

(۶) ایک جماعت کہتی ہے کہ اعجاز قرآن کا اصل راز اُس کے احکام و تعلیمات میں ہے کہ کوئی انسانی دماغ اس طرح کے معتدل اور پُر از حکمت و ہدایت احکام وضع نہیں کر سکتا۔

(۷) کچھ حضرات کی رائے ہے کہ قرآن مجید کا اعجاز اُس کی حیرت انگیز تاثیر ہے جس سے عربی کا ذوق نہ رکھنے والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

(۸) کسی کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ قرآن مجید کا اعجاز یہ ہے کہ وہ دلوں کے چھپے ہوئے بھید ظاہر کر دیتا تھا جن تک کسی انسان کی رسائی ہو ہی نہیں سکتی۔[۵]

(سلہ حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ آیندہ پر)

لیکن اصل یہ ہے کہ یہ تمام توجیہات اپنی اپنی جگہ پر قرآن مجید کے حسن تمام و کمال کے کسی ایک رُخ کو نمایاں کرتی ہیں ان میں باہمی کوئی تعارض و تضاد نہیں۔ فرض کرو حسن و جمال کا کوئی پیکر اتم اگر چند مختلف الذوق لوگوں کے سامنے آجائے تو اُس میں سے ہر شخص کس طرح اپنے اپنے مذاق کے مطابق اُس کی تشریح و توضیح کرے گا۔ کوئی تناسب اعضاء و جوارح پر فریفتہ ہوگا۔ اور کسی کو رنگ و نزہت پر شیفتگی ہوگی کوئی قد و قامت کی موزونیت پر دل و جان فدا کرے گا اور کسی کو لب لعلین و کاکل مشکیں کا سودا ہوگا۔ کسی کے لئے چشم نرگسی جادوئے بابل کا کام کریگی۔ اور کوئی جمالِ آتشیں کی فسوں کاریوں کا ہلاک ستم ہوگا۔ غرض یہ ہے کہ حسن جب کامل اور جمال جب اتم ہوتا ہے تو اُس کی ہر ہر ادا اہلِ نظارہ کو دعوت نظر و دید دیتی ہے اور پھر حُسن نظارہ سوز کی جلوہ پاشیوں میں نگہ اشتیاق کی تنگ پائی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اسے قدم قدم پر "جا ایں جاست" کا سماں نظر آتا ہے اور وہ وہیں محو حیرت ہو کر رہ جاتی ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

لیکن جو اہلِ نظر ہوتے ہیں وہ جان لیتے ہیں کہ اگرچہ تعبیریں مختلف ہیں اور انداز ہائے بیان بھی بدلے ہوئے ہیں لیکن یہ سب رہنمائی کرتی ہیں ایک ہی کی طرف اور یہ سب بیانات ایک حقیقت کلی کی ہی جزئی تشریحات ہیں۔

عبادا تنا شتّی وحسنک واحدٌ　　　وکُلّ اِلٰی ذاکَ الجمال یشیرُ

قرآن مجید نے خود اپنے اعجاز کا دعویٰ کیا ہے۔ اور منکرین کو چیلنج دیا ہے کہ اگر وہ اُسے کلام الٰہی نہیں مانتے تو انھیں چاہیئے کہ اُس کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سورۃ کا مثل لاکر دکھائیں۔

(اس کا) حاشیہ صفحہ گذشتہ حضرت شاہ ولی اللہ نے الفوز الکبیر باب سوم میں علامہ ابن حزم نے الفصل فی الملل والنحل میں اور علامہ سیوطی نے اتقان میں اور امام رازی نے تفسیر کبیر میں ان وجوہِ اعجاز پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔

اس بنا پر ہم کو ان اختلافات سے قطع نظر کرکے خود قرآن میں تلاش کرنا چاہیئے کہ وہ اپنے وجوہِ اعجاز میں کیا دلائل پیش کرتا ہے۔ گذشتہ باب "وحی اور قرآن" میں بھی ان دلائل کا اجمالی ذکر آچکا ہے۔ ہم یہاں ان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے اس سلسلہ میں پانچ چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمیت (۲) گذشتہ اقوام کے واقعات اور آئندہ واقعات کے متعلق پیشنگوئیاں (۳) فصاحت و بلاغت (۴) قرآنی احکام و مسائل (۵) قرآن کی غیر معمولی تاثیر۔ ذیل میں انھیں پانچ امور کی تفصیل درج ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امیت قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ — آپ قرآن سے پہلے نہ تو کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے
كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا — اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا
لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ — تو البتہ یہ باطل پرست شک کرسکتے تھے۔ بلکہ یہ تو
بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ — کھلی آیتیں ہیں اُن لوگوں کے سینوں میں جنکو علم
وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۝ — بخشا گیا ہے اور ہماری آیات ظالم ہی انکار کرتے ہیں

پھر اسی سورۃ میں آگے چل کر ہے

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ — کیا اُن لوگوں کے لئے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ
الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ — ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جو اُن پر تلاوت
لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ — کی جاتی ہے، اس میں ایمان والوں کے لئے
(عنکبوت) — رحمت اور نصیحت ہے۔

دیکھو ان آیات میں اللہ تعالیٰ کس طرح قرآن مجید کے وحی الٰہی ہونے اور اُسکے منجانب اللہ

نازل ہونے کی نشانی (آیت) یہ بتاتا ہے کہ وہ ایک ایسے نبیِ امی پر نازل ہوا ہے جو نہ کوئی کتاب پڑھ سکتا تھا اور نہ کچھ لکھنا جانتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمیت ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے کہ آپ کی دعوتِ توحید و اسلام پر برہم ہو کر کفارِ مکہ نے کیا کچھ نہیں کہا۔ وہ کونسا افترا اور بہتان تھا جو ان لوگوں نے پیغمبرِ حق کے برخلاف نہیں باندھا۔ آپ کو (معاذ اللہ) ساحر کہا۔ کاہن کہا۔ سب کچھ کہتے رہے اور ایذا رسانی میں بھی انھوں نے کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہیں کیا لیکن یہ کہنے کی جرأت کسی کو نہ ہو سکی کہ آپ اُمی کہاں ہیں؟ آپ تو نزولِ قرآن سے پہلے بھی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ عکاظ اور ذو المجنہ کے سالانہ اجتماعات میں اِدھر اُدھر کے آتش بیان خطیب اور نامور شعرا، جمع ہو کر جوہرِ سخن کی نمائش کرتے اور اس آن بان سے فصاحت و بلاغت اور زورِ بیان و کلام کی داد دیتے تھے کہ تمام مجمع میں دھوم مچ جاتی تھی۔ لیکن آنحضرت صلعم کی بعثت سے پہلے جو عمرِ مبارک کے چالیسویں سال ہوئی کسی ایک شخص نے بھی نہیں دیکھا اور نہ سُنا کہ آپ نے بھی کسی مجمع میں شریک ہو کر کوئی پر زور خطبہ دیا ہو۔ حالانکہ اگر قرآنی فصاحت و بلاغت کا ملکہ آپ کا ایک ذاتی وصف تھا تو اس کا ظہور روز روز نہیں چالیس سال کی عمر سے پہلے کبھی ایک مرتبہ تو ہوا ہوتا۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر انسان کے ذاتی جوہر و کمال کے اُبھرنے اور نمایاں ہونیکا زمانہ اُسکا عہدِ شباب ہوتا ہے۔ چالیس برس کی عمر سے تو قویٰ میں انحطاط کے ساتھ انسان کے ذاتی ملکات و اوصاف میں بھی انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔

ہاں اس میں شبہ نہیں کہ سید کونین عرب میں سب سے زیادہ فصیح تھے۔ چنانچہ آپ نے خود فرمایا ہے "میں تم سب میں فصیح تر ہوں کیونکہ میں قریش کے خاندان سے ہوں اور میری زبان بنو سعد کی زبان ہے (طبقات ابن سعد ج ۱) لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس غیر معمولی فصاحت و بلاغت کے باوصف آپ نے نبوت ملنے سے پہلے کبھی کہیں ایک مرتبہ بھی کوئی ایسا خطبہ دیا جو قرآن مجید

کے اندازِ بیان اور اسلوب کلام سے ملتا جلتا ہو جس میں قرآن کے بیان کے مطابق حکمت و موعظت اور اسرارِ عالم اور کائنات کے گنجینے بھرے ہوئے ہوں؟ پھر اگر ایسا ہوتا تو آپکی وہ حیرت و گمشدگی کی حالت کس طرح ہوسکتی تھی جو نزولِ وحی کے بالکل آغاز میں ہوئی اور جس کی طرف قرآن مجید نے

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ — اور خدا نے آپکو حیرت زدہ پایا اور اسنے ہدایت دی

کہہ کر اشارہ کیا ہے۔

پس سوچو اور غور کرو کہ کیا یہ قرآن کا اعجاز نہیں ہے کہ عرب کا ایک گوشہ نشین اُمّی جو نہ لکھنا جانتا ہے اور نہ پڑھنا۔ اور جو نہ علماء کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا ہے اور نہ (ایک دو معمولی سفروں کے علاوہ) کہیں مکہ سے باہر آتا جاتا ہے جو فصاحت و بلاغت اور شعر و خطابت کی عام گرم بازاری کے اور خود اُس فضا میں رہنے کے باوجود نہ ایک شعر موزوں کر سکتا ہے اور نہ کوئی خطبہ دیتا ہے۔ لوگ اُسے "صادق" "امین" اور "راستباز" کی حیثیت سے جانتے پہچانتے ہیں۔ لیکن حکمت آب فصیح و بلیغ کی حیثیت سے اُسے کوئی شہرت حاصل نہیں ہے۔ وہ عمر کا بہترین حصہ (چالیس سال سے پہلے تک کا) اسی گمنامی میں بسر کر دیتا ہے۔ پھر جب قویٰ میں انحطاط کا زمانہ شروع ہوتا ہے تو یہی امی ایک بالکل عجیب و غریب طریقہ پر دنیا کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ جو لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتا تھا۔ اُس نے عالمِ کون و فساد کے حقائق سے نقاب اُلٹ دی۔ حکمت و ہدایت کے دفتر کھول دیئے، بڑے بڑے فلاسفر جن اسرار و رموزِ کائنات کی گرہ کشائی نہیں کر سکتے تھے اُس نے چشم زدن میں اُن سب کو حل کر کے رکھ دیا پھر اسی خاموش اُمّی کی زبانِ حق ترجمان سے جو پیغام "قرآن" کے نام سے نکلا اُس نے فصاحت و بلاغت کے ایسے ایسے گوہر ہائے گرانمایہ کا انبار لگا دیا کہ بڑے بڑے فصحاء و بلغاء کی زبانیں بار بار کے چیلنج کے باوجود اُس کے کسی ایک حصہ کا جواب لانے سے بھی گنگ ہوگئیں اور اس

امی کی زبان کا ایک ایک لفظ شدید ترین ظلمتوں میں بھی حقانیت وصداقت کا آفتاب جہانتاب بن کر چمکا اور اس طرح چمکا کہ

عالم تمام مطلع انوار ہوگیا

شیخ سعدی کی نعت کے یہ دو شعر پڑھو اور دیکھو کہ اس کا ایک ایک لفظ کس طرح اصل حقیقت کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی کرتا ہے۔

کلیمے کہ چرخ فلک طور اوست　　ہمہ نورہا پرتو نور اوست

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست　　کتب خانۂ چند ملت بشست

تو پھر بتاؤ کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمیت قرآن کے اعجاز کی دلیل نہیں ہے اور کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن آنحضرت کا نہیں بلکہ خدا کا کلام ہے؟

واقعات غیب قرآن مجید کے بیان کے مطابق قرآن کے وحی ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اس میں پچھلی قوموں کے اُن صحیح صحیح واقعات کا بیان ہے جن کے علم کا کوئی ذریعہ آپ کے پاس موجود نہیں تھا۔ اس طرح کے واقعات کا علم آپ کو تین طریقوں سے ہی ہو سکتا تھا ایک یہ کہ یہ سب واقعات آپ کے سامنے پیش آتے۔ دوسرے یہ کہ آپ نے اُن کو کسی کتاب میں پڑھا ہوتا تیسرے یہ کہ آپ کی صحبت ایسے لوگوں کے ساتھ رہی ہوتی جنھیں ان واقعات کا علم تھا اور آپ اُن سے ان کا تذکرہ سنتے۔ قرآن مجید ان تینوں ذرائع میں سے ہر ایک کی نفی کرتا ہے۔ پہلے ذریعۂ علم کی نسبت حضرت موسیٰ کے قصہ میں ارشاد ہے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ	آپ مغربی جانب میں نہ تھے جب ہم نے موسیٰ کو
اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ	اپنا حکم بتایا اور نہ آپ وہاں دیکھ رہے تھے
الشّٰهِدِيْنَ وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا	لیکن ہم نے کئی جماعتیں پیدا کیں اور اُن پر

فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِي أَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَلَٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا وَلَٰكِنْ رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَا أَتَاهُمْ مِنْ نَذِيرٍ مِنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (قصص)

مدت دراز گذر چکی اور نہ آپ مدین والوں میں تھے کہ اُن کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے ہوتے لیکن ہم رسول بھیجتے رہتے ہیں اور نہ آپ طور کے کنارے تھے جب ہم نے اُنکو ندا دی لیکن یہ آپکے رب کا انعام ہوا کہ آپ ان لوگوں کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانیوالا نہیں آیا ہو تاکہ یہ موعظت گیر ہوں

حضرت مریم اور حضرت زکریا کے واقعہ میں ہے۔

ذَٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ۝ (آل عمران)

یہ گذشتہ زمانہ کی خبروں میں ہو جسکو ہم بذریعہ وحی آپ پر نازل کرتے ہیں اور آپ اُن کے پاس موجود نہ تھے جب وہ اپنا پانسہ ڈال رہے تھے اور نہ آپ اُس وقت موجود تھے جبکہ وہ جھگڑ رہے تھے۔

حضرت یوسف کے واقعہ میں بھی اسی طرح ارشاد ہے۔

دوسرا ذریعہ علم یہ تھا کہ آپ ان واقعات کو کسی کتاب میں پڑھتے۔ قرآن اس کی بھی نفی کرتا ہے. چنانچہ اس سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمیت کے بیان میں جو آیت گذر چکی ہے اُس میں اس مضمون کی صاف تصریح ہے اس کے علاوہ ایک اور آیت بھی ہے۔

مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ (شوریٰ)

آپ کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب کیا ہو اور ایمان کسے کہتے ہیں۔

تیسرا ذریعۂ علم یہ ہو سکتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان واقعات کو کسی سے سنتے۔ قرآن مجید اس کی بھی نفی کرتا ہے۔ ارشاد ہے۔

تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهَآ اِلَیْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا (ہود)

یہ غیب کی باتیں ہیں جو آپ پر ہم بطور وحی نازل کرتے ہیں اس سے پہلے ان باتوں کو نہ آپ جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم جانتی تھی۔

ہر شخص جانتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے چالیس سال کی زندگی مکہ معظمہ میں گذاری۔ اس تمام مدت میں آپ کا صرف دو مرتبہ شام کے سفر میں جانا ثابت ہے۔ ایک مرتبہ آپ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ گئے تھے۔ اس وقت آپ کا عہدِ طفولیت تھا۔ اور دوسری مرتبہ آپ عہدِ شباب میں تشریف لے گئے تھے لیکن یہ سفر چند روز کے لئے تھا۔ قیامِ مکہ کے زمانہ میں آپ قریش والوں میں ہی رہتے سہتے تھے اور یہ لوگ جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے اہلِ کتاب نہ ہونے کے باعث گذشتہ اقوام وملل کی تاریخ سے بالکل ناآشنا تھے۔ اس بنا پر ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ تیسرا ذریعۂ علم بھی سر بسر مفقود تھا۔

ان تینوں ذرائع علم کی نفی کے بعد قرآن کا یہ فرمان کہ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ خود بخود واضح ہو جاتا ہے اور ایک ایسی حقیقتِ مسلمہ بن کر سامنے آتا ہے کہ کسی کو اُس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کفار و مشرکین جس طرح آپ کی اُمیت کی تکذیب نہیں کر سکے۔ اُن میں سے کسی ایک شخص کو بھی یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ "آپ یہ کیسے فرماتے ہیں کہ یہ واقعاتِ غیب مجھ کو وحی سے معلوم ہوئے ہیں آپ تو یہ واقعات فلاں شخص سے سنتے تھے، یا اُس کے پاس آپ کی نشست و برخاست تھی"۔ اس قسم کے دعوے کا اظہار اگر ہوتا تو علماء یہود و نصاریٰ کی طرف سے ہو سکتا تھا، اور حضور کی مدنی زندگی میں انھوں نے بار بار اس کا امتحان بھی لیا لیکن آخر کار اُن کو بھی قرآن کے وحیِ الٰہی ہونے کا اقرار

کرنا پڑا۔ اور کسی ایک شخص کو بھی آنحضرت کی امیت کا انکار کرنے کا حوصلہ نہیں ہوسکا۔

واقعات آئندہ کی پیشنگوئی اخبار عن الغیب کے سلسلہ میں قرآن مجید کی وہ پیش گوئیاں بھی داخل ہیں جو بعض نہایت ہی مستبعد امور سے متعلق ہیں اور جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوکر رہیں۔

غلبہ روم کی پیشین گوئی ان پیشین گوئیوں میں سب سے زیادہ حیرت انگیز اور نمایاں تر پیشین گوئی غلبۂ روم کی ہے قرآن میں اس کا ذکر اس طرح ہے۔

الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِیْٓ اَدْنَی — الم۔ قریب کے ملک میں رومی مغلوب ہوگئے ہیں
الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ — اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد چند سال میں
سَیَغْلِبُوْنَ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ لِلّٰهِ الْاَمْرُ — غالب آجائینگے اللہ کے ہی ہاتھ ہے سب کام
مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ وَیَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ — پہلے اور پچھلے، اور اس دن مسلمان خوش ہونگے
الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ یَنْصُرُ مَنْ — اللہ کی مدد سے، اللہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے
یَّشَآءُ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝ وَعْدَ — اور وہی زبردست اور رحم کرنے والا ہے۔ اللہ
اللّٰهِ لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰکِنَّ — کا وعدہ ہوچکا۔ اللہ اپنے وعدہ کے خلاف
اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (الروم) — نہ کریگا۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے تھے۔

جنگ روم و ایران کا واقعہ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ عرب کے دائیں بائیں روم اور ایران کی دو طاقتور حکومتیں قائم تھیں۔ رومی حکومت عیسائی تھی اور ایرانی سلطنت مجوسی۔ دونوں میں ایک عرصہ سے کش مکش چلی آرہی تھی۔ ایرانی سلطنت کے تخت پر نوشیرواں کا پوتا اور ہرمز کا بیٹا خسرو (Chosroes) قابض تھا اور رومی حکومت کی عنانِ اختیار و اقتدار ہرقل (Heraclius) کے ہاتھ میں تھی۔ ان دونوں حکومتوں میں جنگ و پیکار کا سلسلہ ۶۰۲ء سے ۶۱۶ء تک جاری رہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت عیسوی تاریخ کے حساب سے ۵۷۰ء میں ہوئی۔

اور سنہ ۶۱۰ء میں آپ کے فرقِ مُبارک پر نبوت و رسالت کا تاجِ زرفشاں رکھا گیا۔ دونوں سرحدوں کے قرب کی وجہ سے مکہ والوں کو طبعی طور پر اس جنگ سے گہری دلچسپی تھی۔ یہاں برابر اسکی خبریں پہونچتی رہتی تھیں۔ ایرانی مجوس یعنی آتش پرست تھے۔ اس لئے مکہ کے کفار و مشرکین کو ان کے ساتھ دلی ہمدردی تھی اور وہ دُعائیں کرتے تھے کہ جنگ میں ایرانیوں کو فتح و کامرانی حاصل ہو۔ لیکن مُسلمان طبعی طور پر رومیوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ عیسائی ہونے کی وجہ سے ایرانیوں کی نسبت ان سے زیادہ قریب تھے۔

ایرانیوں کی فتح

لیکن ایرانی فوج نہایت طاقتور اور منظم تھی اور ادھر رومی فوج کا ایک بہترین جنرل نارسیس قسطنطنیہ کے بازار میں زندہ جلوا دیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانیوں نے ایک طرف دجلہ و فرات کے کناروں سے شام کی طرف بڑھنا شروع کیا اور دوسری جانب (ایشیار کوچک میں) وہ آذربائجان آرمینیہ ہوکر اناطولیہ میں داخل ہو گئے۔ رومی افواج کو دونوں طرف سخت ہزیمت اور پسپائی سے دوچار ہونا پڑا۔

یورپ کے مشہور مورخ گبن کا بیان ہے کہ اس جنگ میں رومیوں کے نوے ہزار آدمی قتل ہوئے۔ کلیساؤں کو آگ لگا دی گئی۔ تین سو برس کی مذہبی نذریں ایک دن میں وقفِ عام ہو گئیں۔ انتہا یہ ہے کہ بیت المقدس سے عیسائیوں کی سب سے زیادہ مقدس صلیب بھی ایران کو منتقل ہو گئی اور قیصر روم ایک جسدِ بیجان ہو کر رہ گیا۔ مشرقی ممالک کے نقصان کے علاوہ یورپ میں بھی ان کی حالت بہتر نہ تھی تمام یورپ میں غدر مچا ہوا تھا۔ اسٹریا (Istria) کی سرحد سے تھرلیس کی دیواروں تک آوارس (Avars) مظالم ڈھا رہے تھے۔ جنگ اطالیہ میں جن معصوم انسانوں کا خون پانی کی طرح بہا تھا وہ بھی ابھی خشک نہیں ہوا تھا کہ آوارس نے پنونیا (Pannonia) کے مقدس میدان میں مرد قیدیوں کو قتل کر دیا عورتیں اور بچے

غلام بنا لئے گئے رومی سلطنت قسطنطنیہ کی دیواروں، یونان اٹلی اور افریقہ کے کچھ بقیہ حصوں اور ایشیائی ساحل کے چند بحری مقامات میں صور سے طرازون تک محدود ہو کر رہ گئی۔ غرض یہ ہے کہ ایک طرف عراق، شام، فلسطین، مصر اور ایشیا کوچک کے وسیع علاقوں میں ایرانی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ ہر جگہ آتش کدے تعمیر ہو رہے تھے اور مسیح کے بجائے آگ اور سورج کی جبری پرستش کرائی جا رہی تھی اور دوسری طرف خود رومن امپائر کی وسیع مملکت میں بغاوتیں برپا تھیں اور ان بغاوتوں میں افریقہ اور یورپ کے علاقے بھی شامل تھے ظاہر ہے ان حالات میں سلطنت روم کے بے نام و نشان ہو جانے میں کیا کسر رہ گئی تھی۔[1]

مشرکین مکہ کی مسرت ان ایرانی فتوحات پر مشرکین مکہ جتنے بھی خوش ہوتے کم تھا۔ وہ اس کو مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے لئے فتح کی ایک نیک فال سمجھتے تھے اور مسلمانوں سے برملا کہتے تھے کہ جس طرح ایرانیوں نے رومیوں کو ہزیمت فاش دی ہے اسی طرح اگر کبھی تم میں اور ہم میں لڑائی ہوئی تو ہم کو بھی تم پر فتح حاصل ہو گی۔ مسلمان اس صورت حالات پر نہایت دل گرفتہ اور رنجیدہ تھے۔ مگر کر کیا سکتے تھے۔ راضی بحکم ایزدی تھے کہ ناامیدی اور مایوسی کی شدید ترین ظلمتوں میں غلبہ روم کی آیات نے (جو پہلے گذر چکی ہیں) نازل ہو کر دلوں میں پھر امید و حوصلہ کی روشنی پیدا کر دی۔

کفار مکہ کا استبعاد اور اس کی وجہ کفار مکہ کو اس پیشین گوئی کا علم ہوا تو انھوں نے اس کو نہایت مستبعد سمجھ کر مسلمانوں کا مذاق اڑایا اور کہا کہ اچھا آؤ ہم تم شرط کریں کہ اگر رومی واقعی غالب آگئے تو ہم

---

[1] گبن نے اپنی کتاب تاریخ زوال روما جلد ۳ میں ایران و روم کی اس جنگ کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے اردو میں علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرت النبی جلد ۳ میں اور ہمارے لائق دوست مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایڈیٹر الندوہ نے الندوہ جلد ۲ نمبر ۵ میں گبن کی تاریخ سے ہی اخذ کر کے اس جنگ کے مفصل حالات لکھے ہیں ہم نے اس بحث میں ان دونوں مضامین سے استفادہ کیا ہے۔

مسلمانوں کو کئی اونٹ دینگے اور اگر اس کے برعکس ظہور ہوا تو مسلمان اونٹ ہار جائینگے حضرت ابوبکرؓ نے مسلمانوں کی طرف سے اس پیشین گوئی کے ظہور کی مدت چھ سال مقرر کی تھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو ارشاد ہوا کہ "بضع" کا لفظ تین سے نو تک پر بولا جاتا ہے اس بنا پر دس سال سے کم کی مدت مقرر کرنی چاہئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس ارشاد نبوی کے مطابق ۹ سال کی شرط کی"[1]

حقیقت یہ ہے کہ نظر بر اسباب ظاہری اُن حالات میں کسی کو یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ابھی چند برسوں میں ہی پانسہ بالکل پلٹ جائے گا اور شکست خوردہ رومی پھر طاقتور ایرانیوں پر غلبہ حاصل کرلیں گے۔ کیونکہ ایک طرف ایرانی فتوحات اور طاقت و قوت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے رومیوں کے مشرقی مقبوضات کا ایک ایک چپہ چھین لیا۔ اور دوسری جانب قیصر روم ہرقل کی عیش پسندی۔ اور غفلت آبی کا یہ حال تھا کہ وہ گبن صاحب کے الفاظ میں پرلے درجہ کا سست، کاہل، اور اپنی قوم اور ملک کی بربادی کا نام و تماشائی تھا"

"تاریخ زوال روما" کا مصنف لکھتا ہے:۔

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایرانی فتوحات کے عین شباب میں پیشین گوئی کی کہ چند سال کے اندر اندر رومی جھنڈے دوبارہ فتح کے ساتھ بلند ہونگے۔ جب یہ پیشین گوئی کی گئی تھی اُس وقت اس سے زیادہ بعید از قیاس کوئی بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ کیونکہ ہرقل کی حکومت کے ابتدائی بارہ سال سلطنت روما کی قریبی تباہی اور خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے۔

بہرحال یہ وہ نامساعد و ناموافق حالات تھے جن میں قرآن کی طرف سے غلبۂ روم کی بظاہر بالکل مستبعد پیشگوئی کا اعلانِ عام کیا گیا۔ ترمذی میں ہے کہ حضرت ابوبکر کو اس قدر خوشی ہوئی

[1] مستدرک حاکم جلد ۲ تفسیر سورۂ روم و ترمذی باب تفسیر سورۂ روم

کہ وہ مکہ کی گلیوں اور بازاروں میں چیخ چیخ کر الم غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون کی تلاوت کرتے پھرتے تھے۔

پیشینگوئی کی صداقت کا ظہور۔ یہ آیت بعثت نبوی کے پانچویں سال نازل ہوئی تھی یعنی عیسوی تاریخ کے لحاظ سے ۶۱۴ء میں جبکہ ایرانیوں کے مقابلہ میں رومیوں کی شکست کا آغاز ہوچکا تھا۔ پھر ہوتے ہوتے ۶۱۶ء میں یہ شکست انتہا کو پہونچ گئی۔ آغاز شکست سے پورے آٹھ برس بعد یعنی ۶۲۲ء میں رومیوں کے تن مُردہ میں پھر جان پیدا ہوئی اور انھوں نے ایرانیوں کے انتہائی جبر وظلم سے تنگ آکر ہرقل کی قیادت میں ایرانیوں پر حملہ کر دیا۔ ۶۲۳ء سے انکو قرآن مجید کی پیشنگوئی کے مطابق اس حملہ میں کامیابی ہونی شروع ہوئی اور انجام کار ۶۲۵ء میں رومیوں کی فتح اس شان سے پایۂ تکمیل کو پہونچی کہ انھوں نے مشرقی مقبوضات کا ایک ایک شہر واپس لے لیا اور ایرانیوں کو باسفورس اور نیل کے کناروں سے ہٹا کر پھر دجلہ و فرات کے ساحلوں تک دھکیل دیا۔ کیا عجیب بات ہے کہ ایرانیوں پر رومیوں کی حیرت انگیز فتح و کامرانی کا سال (بلکہ بعض روایتوں کے مطابق مہینہ اور دن بھی) بعینہ وہی سال تھا جس میں مُسلمانوں کی تین سو تیرہ کی جماعت قلیل کو نو سو سے زیادہ مسلح کافروں کی بھاری تعداد کے بالمقابل بدر کے میدان میں عظیم الشان فتح حاصل ہوئی تھی۔

اب غور کرو، قرآن مجید نے غلبۂ روم کی جو پیشینگوئی کی تھی اُس میں چند باتیں خاص طور پر لحاظ کے قابل ہیں۔

(۱) یہ پیشینگوئی حد درجہ ناسازگار حالات میں کیگئی جبکہ رومیونکی فتح کا بعید سا احتمال بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

(۲) پیشینگوئی میں غلبۂ روم کی کوئی طول طویل مدت مقرر نہیں کی گئی۔ بلکہ صرف نو سال بتائے گئے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ رومیوں کو جس شان کی شکست ہوئی تھی اُس کے

اعتبار سے قیاس نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ نو برس کی قلیل مدت میں اپنی عظمت رفتہ واپس لے لینگے

(۳) پھر یہ دیکھو کہ رومیوں کو شکست جس سست اور عشرت پسند کمانڈر کے ہاتھوں ہوئی تھی اب یہ فتح بھی اُسی کے زیر قیادت ہوئی ہے۔ گویا یہ وہ پہلا ہرقل ہے ہی نہیں۔

(۴) پیشنگوئی کے جو الفاظ ہیں نہایت واضح اور صاف صاف ہیں اُن میں کاہنوں اور نجومیوں کی پیشینگوئیوں کی طرح ابہام وخفا یا شک وتردد کی ہلکی سی آمیزش بھی نہیں ہے۔ دیکھو کس محکم جزم و یقین کے ساتھ ارشاد ہے۔

وَعْدَ اللّٰهِ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ — یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ اللہ اپنے وعدہ کا خلاف

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (الروم) — نہیں کرتا۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں۔

(۵) دنیا جانتی ہے کہ قرآن کی یہ حیرت انگیز پیشینگوئی کس طرح حرف بحرف پوری ہوئی اور ٹھیک اُسی مدت میں جو قرآن نے مقرر کی تھی۔

اب خود سوچو اور بتاؤ کہ کیا قرآن کی یہ پیشینگوئی اور اُس کا سچ ثابت ہونا قرآن کے اعجاز کی اور اُس کے وحی الٰہی ہونے کی بیّن دلیل نہیں ہے؟ یہی وجہ ہے کہ اس پیشینگوئی کی صداقت کو دیکھ کر بہت سے کافر مسلمان ہو گئے[۵]۔

چند اور پیشینگوئیاں اس خاص پیشینگوئی کے علاوہ قرآن مجید میں اور بھی پیشینگوئیاں ہیں جو بعد میں حرف بحرف پوری ہو کر رہیں۔ تاریخ اسلام کا مشہور واقعہ ہے کہ جب مسلمان صلح حدیبیہ سے واپس لوٹے تو اُن میں ایک عام بد دلی پائی جاتی تھی اور وہ اس صلح کو اپنے لئے شکست کے مترادف سمجھتے تھے یہاں تک کہ بعض بعض نے تو صاف لفظوں میں اس کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ اس پر قرآن مجید نے یہ مژدۂ جانفزا سنایا۔

---

[۵] ترمذی تفسیر سورۂ الروم

إِنَّا فتحنا لكَ فتحاً مبيناً — ہمنے تو تمہارے لئے عظیم الشان فتح مقدر کر دی ہے

اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ حدیبیہ کی صلح کو شکست نہ کہو، بلکہ یہ درحقیقت پیش خیمہ ہے ایک عظیم الشان فتح کا جو فتح مکہ کے نام سے معروف ہو. چنانچہ اسی سورۃ میں ارشاد ہے۔

لتدخلنَّ المسجدَ الحرام اِنْ — تم اگر اللہ نے چاہا تو مسجد حرام میں ضرور داخل ہوگے
شاءَ اللّٰہُ امنین مُحلّقین رؤوسکم — مامون ومحفوظ کچھ اپنا سر منڈائے ہونگے اور کچھ
ومُقصّرین لا تخافون (الفتح) — بال ترشوائے ہوئے اور تم خوفزدہ نہیں ہوگے

پھر غزوۂ خیبر میں مسلمانوں کو جو مال غنیمت ملا۔ اُس کے متعلق پیشینگوئی بھی اس آیت میں پہلے ہی کر دی گئی تھی۔

سَیَقُوْلُ المُخَلّفُوْنَ اِذَا انطلقتم اِلٰی — پیچھے رہ جانے والے اعراب کہیں گے جبکہ تم مال
مَغَانِمَ لتاخذُوھا ذرونا نتّبعکم — غنیمت کو لینے جاؤ گے کہ تم ہم کو چھوڑ دو کہ ہم بھی
(الفتح) — تمہارے پیچھے پیچھے چلیں۔

فتح مکہ اور فتح خیبر کی پیشینگوئیوں سے زیادہ حیرت انگیز وہ پیشینگوئی ہے جس میں مسلمانوں سے تمکن اور استخلاف فی الارض کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَعَدَ اللّٰہُ الّذین آمنوا منکم — تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور
وعملوا الصالحاتِ لیستخلفنّھم — نیک عمل کرتے ہیں اللہ نے اُن سے وعدہ کیا ہو کہ وہ ضرور
فِی الارضِ کما استخلفَ الّذینَ — اُن کو زمین میں ایسا ہی خلیفہ بنائے گا جیسا کہ
مِنْ قبلھم ولیمکننّ لھم دینھم — اُن سے پہلے لوگوں کو بنایا ہے اور وہ یقیناً
الّذی ارتضیٰ لھم — اُن کے اُس دین کو جس سے وہ (خدا) راضی
(مومنون) — ہو گیا ہے طاقتور بنائے گا۔

یہ پیشینگوئی اُس وقت کی گئی جبکہ عرب کے دونوں طرف ایران اور روم کی دو زبردست سلطنتیں قائم تھیں، اس وقت کسی شخص کو یہ خیال بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ چند برسوں میں ہی ایک وقت وہ آئے گا جبکہ عرب کے بے سروسامان مسلمانوں کی ایک جماعت ان دونوں کو زیر وزبر کرکے رکھ دیگی لیکن اللہ وعدہ کرچکا تھا۔ اُس میں تخلف کس طرح ہوسکتا تھا۔ بالآخر دنیا نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے پچاس برس بعد ہی مُسلمانوں نے ایک طرف ایرانی سلطنت کی پُرانی حشمت وشوکت کو ختم کرکے رکھ دیا اور دوسری طرف مشرقی رومن امپائر کے بہت سے صوبوں پر شام سے لے کر مولونیش کے انتہائی سرے تک قبضہ کرلیا۔ رب العزت نے مسلمانوں سے استخلاف فی الارض کا جو وعدہ کیا تھا وہ نصف صدی میں ہی اس طرح پورا ہوا کہ خلافت عظمیٰ کا دائرہ اقتدار مشرق میں سندھ تک پھیل گیا۔ مغرب میں بحر اٹلانٹک تک اور شمال میں اُسکا پرچم عظمت اناطولیہ کے قلب وجگر پر لہرایا۔

مسلمانوں کی ان حیرت انگیز فتوحات پر تبصرہ کرتے ہوئے گبن صاحب قرآن کی پیشگوئی کی صداقت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"شاید اب قرآن کی تفسیر آکسفورڈ کے اسکولوں میں پڑھائی جائیگی اور اُس کے ممبروں سے مقدس لوگوں کے لئے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وحی کی صداقت اور اُس کے تقدس کا اظہار کیا جائے گا۔"[۵]

علاوہ ازیں یہ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہٗ لحافظون

ہم نے ہی قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اُس کی حفاظت کرینگے

[۵] The Decline and Fall of Roman Empire

فرمایا کر قرآن کی حفاظت کا۔ اور

واللّٰہُ یعصِمُکَ مِنَ النَّاس   اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔

فرمایا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا جو وعدہ کیا تھا وہ کس طرح حرف بحرف پورا ہو کر رہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دینے کے کیسے کیسے منصوبے باندھے گئے اور کیا کچھ سازشیں نہیں ہوئیں اور پھر آنحضرت مسلح فوجیوں کی حفاظت میں یا کسی مضبوط قلعہ میں بھی نہیں رہتے تھے۔ لیکن چونکہ خدا وعدہ کر چکا تھا اس لئے دشمنوں کی تمام تدبیریں ناکام رہیں اور وہ آپ کا کچھ نہ کر سکے۔ اسی طرح قرآن کو دیکھو اس کو نازل ہوئے چودہ سو برس ہونے کو آئے اور اس کے باوجود اس کا حرف حرف بلکہ اعراب اور علاماتِ آیات تک جوں کی توں محفوظ ہیں اور صرف کاغذوں میں نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں کے سینوں میں کیا دنیا کی کوئی اور کتاب بھی اس طرح محفوظ ہے ؟

اس اخبار بالغیب میں جو قرآن کے وجوہِ اعجاز میں سے ایک وجہ ہے۔ قرآن مجید کے وہ قصص بھی داخل ہیں جو انبیاء کرام علیہم السلام یا دوسری اقوام سے متعلق ہیں اور منافقوں کے دلوں میں چھپے ہوئے اُن بھیدوں کی اطلاع بھی داخل ہے جن کا ذکر زیادہ تر سورۂ توبہ میں ہے۔

فصاحت و بلاغت | قرآن مجید کے اعجاز کی ایک بڑی وجہ اُس کا انتہائی فصیح و بلیغ ہونا ہے۔ اس کی تفصیلات میں اگرچہ اختلافات ہیں، لیکن اجمالاً یہ عقیدہ ہر قرن اور ہر دور میں جمہور امت کے نزدیک مسلم رہا ہے کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کا مثل نہیں لایا جا سکتا۔ قرآن نے خود اپنی فصاحت و بلاغت کا اظہار چند آیتوں میں کیا ہے جو درج ذیل ہیں۔

لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ   جس کی طرف یہ کفار نسبت کرتے ہیں اُس کی

وَهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ   زبان تو عجمی ہے اور یہ قرآن کی زبان نہایت

(نحل)   واضح اور صاف عربی ہے۔

قرآناً عربیاً غیر ذی عوج (زمر) قرآن عربی زبان میں ہے جس میں کوئی کجی نہیں ہے

قراٰنٌ مُّبینٌ — نہایت واضح اور صاف قرآن

بلسانٍ عربیٍ مُّبینٍ — یہ قرآن ایسی زبان میں ہے جو مدعا کو وضاحت سے بیان کرتی ہے۔

فصاحت و بلاغت ذوقی و وجدانی چیز ہے | اس بحث کے سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اگرچہ علماء معانی و بیان نے فصاحت و بلاغت اور اُن کے مدارج و مراتب کی تعین کے لئے بڑی محنت اور تلاش و جستجو سے اصول و قواعد مدون کئے ہیں اور ان کی تشریح و توضیح میں نہایت طول طویل بحثیں کر کے ذہانت و طباعی کی داد دی ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ باعتبار فصاحت و بلاغت دو کلاموں میں موازنہ و ترجیح کا کام اہل لسان کے ذوق و وجدان سے ہی متعلق ہے۔ اور اس قضیہ میں اُن کے ذوق کا فیصلہ ہی دلیل قاطع کا حکم رکھتا ہے۔ چنانچہ کتاب الطراز کے مصنف فصاحت کلام پر طویل بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

”یہ جو کچھ بھی ہم نے کہا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی لفظ کے حسنِ تالیف کے فیصلہ کا دارومدار ذوق سلیم اور طبع مستقیم پر ہے۔ قواعد و ضوابط پر نہیں جیسا کہ لوگوں نے سمجھا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہی چند حروف ہیں کہ اگر ایک خاص ترتیب سے اُن سے ایک لفظ بنایا جائے تو وہ انتہائی غیر فصیح اور رکیک ہوتا ہے لیکن اگر انھیں حروف سے اس ترتیب کو بدل کر کسی اور ترتیب سے ایک لفظ بنایا جائے تو وہ فصیح تر ہو جاتا ہے۔ مثلاً لفظ مَلَعَ اور عَلِمَ“[۱]

جب خود اہل زبان بلاغت کا ذوق رکھنے میں یکساں نہیں ہوتے تو غیر اہل زبان کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ قرآن کے وجوہ اعجاز کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

---

[۱] کتاب الطراز ج ۱ ص ۱۰۸ و ۱۰۹

ازاں جملہ درجۂ علیا، از بلاغت کہ مقدور بشر نباشد وچوں ما بعد عرب اوّل آمدہ ایم بکنہ آن نمی توانیم رسید۔ لیکن ایں قدر می دانیم کہ استعمال کلمات وترکیبات عذبہ جزلہ، بالطاف وعدم تکلف قدرے کہ در قرآن می یابم در ہیچ قصیدہ از قصائد متقدمین ومتاخرین نمی یابم وایں امریست ذوقی کہ مہرہ از شعرا آں را بخوبی میتوانند دانست وعوام آں ذائقہ ندارند۔[1]"

اسی بنا پر امام راغب اصفہانی نے بالکل درست کہا ہے کہ جو لوگ وجدان صحیح اور ذوقِ سلیم رکھتے ہیں اُن کے لئے اعجازِ قرآن کی کسی دلیل کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں وہ خود ہی اُس کے قائل ہو جاتے ہیں ان کے برخلاف جو لوگ اعجازِ قرآن کی دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں وہ دو قسم کے اشخاص ہوتے ہیں ایک وہ جو ناقص ہونے کی بنا پر کلام الٰہی اور کلام بشری میں امتیاز نہیں کر سکتے اور دوسرے وہ جو نقص کے باوجود عناد بھی رکھتے ہیں۔[2]

قرآن مجید کی فصاحت وبلاغت کا اندازہ ان لوگوں کو ہی ہو سکتا ہے جو سلامتِ ذوق اور استقامتِ طبع کے ساتھ عرب کے اساتذۂ شعر وسخن کے کلام کا مطالعہ کئے ہوئے ہوں اور جنھوں نے علم معانی وبیان پر اساتذۂ متقدمین کی کتابوں کا مطالعہ کر کے اپنے ذوق ووجدان کو پختہ اور شائستہ بنا لیا ہو۔[3]

---

[1] الفوز الکبیر ص ۳۸ [2] کتاب الذریعہ ص ۷۰

[3] ہمارے ہندوستان کے مدارس عربیہ میں ان فنون کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ اس مقصد کے لئے بالکل ناکافی ہیں ان کی جگہ اگر کتب ذیل پڑھائی جائیں تو خاطرخواہ فائدہ ہو سکتا ہے (۱) اسرار البلاغۃ و دلائل الاعجاز امام عبدالقاہر جرجانی (۲) کتاب الصناعتین ابوہلال العسکری (۳) الخصائص ابن جنی (۴) اساس البلاغۃ زمخشری (۵) کتاب الطراز یحییٰ بن حمزہ (۶) کتاب الفوائد حافظ ابن قیم (۷) مغنی اللبیب ابن ہشام

بلغاء و شعراء عرب پر قرآنی بلاغت کا اثر جو لوگ اس نعمتِ خداداد سے بہرہ وافر رکھتے ہیں وہ خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم بہرحال اس پر مجبور رہیں کہ بلاغت و فصاحت کے اعتبار سے بھی قرآن کے اعجاز کے قائل ہوں۔ چنانچہ تاریخ ادبیات عرب کا مطالعہ کیا جائے تو اس قسم کے صدہا واقعات ملتے ہیں کہ لوگوں نے قرآن مجید کی ایک آیت سنکر ہی اس کے وحی الٰہی ہونے کا اقرار کر لیا ہے۔

عتبہ بن ربیعہ قریش کا بڑا صاحب اثر و رسوخ شخص تھا۔ بدر کی جنگ میں مارا گیا ہے

ایک مرتبہ اہل قریش کے ساتھ ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم الگ مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ عتبہ اہل مجلس کے مشورہ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا ارادہ یہ تھا کہ آپ کو مال وغیرہ کا لالچ دے کر دعوتِ اسلام سے باز رکھنے کی کوشش کرے عتبہ اپنی تقریر ختم کر چکا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حٰم تنزیل من الرحمٰن الرحیم کی سورۃ کا کچھ حصہ تلاوت کر کے سنایا۔ عتبہ نے اپنے دونوں ہاتھ پس پشت لیجا کر ان پر ٹیک لگا لی اور نہایت خاموشی سے سنتا رہا۔ سورۃ کی تلاوت کرتے کرتے آنحضرت صلی اللہ آیتِ سجدہ تک پہنچے تو آپ نے سجدۂ تلاوت کیا۔ اور پھر عتبہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: "ابو الولید! کیا اب بھی تم اپنے اسی پرانے خیال پر جمے ہوئے ہو؟ عتبہ یہ سنکر اپنے لوگوں میں واپس چلا آیا۔ لیکن قرآن مجید کی آیات کو سننے کا اثر اس کے چہرہ بشرہ سے ظاہر ہو رہا تھا۔ ارباب مجلس نے جب اس سے پوچھا تو کہنے لگا۔ "خدا کی قسم! میں نے ایک ایسا کلام سنا ہے کہ اس جیسا آج تک سنا ہی نہیں تھا۔ بخدا! یہ کلام ہرگز ہرگز نہ شعر ہے نہ کوئی جادو ہے اور نہ کسی کاہن یا نجومی کا قول ہے" اے قریش! او تم میری بات مانو"[1]

انیس قبیلہ غفار کے بڑے نامور شاعر تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچا سنکر

---

[1] شرح زرقانی علی المواہب ج ۵ ص ۹۸، ۹۹

چھپے چوری مکہ آتے اور آنحضرت کی زبان مبارک سے قرآن مجید کی کچھ آیتیں سنکر واپس گئے۔ ان کے بھائی حضرت ابوذر نے پوچھا کہ تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیسا پایا؟ وہ بولے، "لوگ کہتے ہیں کہ وہ شاعر ہیں۔ ساحر ہیں یا کاہن ہیں، لیکن میں نے کاہنوں کا کلام سنا ہے اور شعر کے اسالیب وطرق سے بھی واقف ہوں، میں نے محمد کے کلام کو ان سب پر منطبق کر کے دیکھا۔ خدا کی قسم! وہ ان سب سے بالکل الگ اور ایک اور ہی عجیب طرح کا کلام ہے۔ بخدا! محمد سچے اور قریش کے لوگ جھوٹے ہیں[۱]۔"

ولید بن مغیرہ بڑا دولت مند اور قریش میں فصاحت کا امام تھا ایک مرتبہ اس نے خدمت نبوی میں حاضر ہوکر کچھ سنانے کی درخواست کی۔ آنحضرت نے ان اللہ یامر بالعدل الی آیت آخر تک تلاوت فرما کر سنائی۔ ولید اس درجہ متاثر ہوا کہ اس نے مکرر تلاوت کرنے کی فرمائش کی جب آنحضرت دوسری مرتبہ بھی سنا چکے تو ولید بولا، "خدا کی قسم اس کلام میں کچھ اور ہی شیرینی ہے اور تازگی بھی نئی قسم کی ہے۔ اس نخل کا اعلیٰ حصہ ثمر آور ہے اور اس کا حصہ زیریں مضبوط تنہ ہے۔ اور کوئی بشر اس جیسا کلام نہیں کرسکتا[۲]۔"

شاہ حبش کے متعلق مشہور ہے ہی کہ جب اس کے دربار میں حضرت جعفر نے سورۂ مریم کی تلاوت کی تو وہ اس درجہ متاثر ہوا کہ بیساختہ آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے، پھر بولا، "خدا کی قسم! یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں[۳]۔"

قبیلہ ازد کے ایک شخص ضماد تھے جھاڑ پھونک کا کام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مکہ آئے اور یہاں کے لوگوں سے سنا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو (نعوذ باللہ) جنون ہوگیا ہے۔ ضماد بہ خیال

---

[۱] صحیح مسلم اسلام ابی ذر — [۲] شرح زرقانی ج ۵ ص ۱۰۰

[۳] مستدرک حاکم ج ۲ ص ۳۱۰

کر کے کہ میں آپ کا علاج کروں گا۔ آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت نے ان کے سامنے مختصر سی حمد اور کلمہ شہادت پڑھا، ضماد پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا اور تین مرتبہ آپ سے اس کا اعادہ کرایا اور پھر کہا، میں نے کاہنوں، جادوگروں اور شاعروں ان میں سے ہر ایک کا کلام سنا ہے لیکن آپ جیسے کلمات تو سنے ہی نہیں، یہ کلام تو سمندر کی گہرائیوں تک اتر جائیگا، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس پر بیعت کرلی[۱]۔

عمرو بن جموح قبیلۂ بنو سلمہ کے نامی گرامی سردار تھے ان کے بیٹے معاذ اسلام قبول کر کے واپس آئے تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پوچھا کہ تم نے آپ سے کیا سنا ہے؟ معاذ نے سورۂ فاتحہ الحمد للہ رب العالمین سے لیکر الصراط المستقیم تک پڑھ کر سنائی۔ عمرو بن جموح پر بڑا گہرا اثر پڑا، کہنے لگے "یہ کلام تو بڑا ہی عمدہ ہے اور خوب ہے کیا آپ کا سب کلام ایسا ہی ہے؟ بولے "جی ہاں! بلکہ اس سے بھی عمدہ" اس کے بعد وہ مسلمان ہو گئے[۲]۔

جس زمانہ میں قرآن مجید نازل ہوا عرب کا بچہ بچہ شعر و شاعری کا ذوق خداداد رکھتا تھا۔ آتش بیان خطبا، قبیلہ قبیلہ میں موجود تھے جو کسی بڑے سے بڑے شاعر و خطیب کے کلام کو نظر میں نہیں لاتے تھے۔ فصاحت و بلاغت کا جوہر ایک ایک شخص کے خمیر میں پڑا ہوا تھا اور وہی ان کے لئے سب سے بڑا سرمایہ نازش و افتخار تھا۔ اب غور کرو فصاحت و بلاغت اور شعر و خطابت کی اس گرم بازاری کی عہد میں مکہ کی خاکِ پاک سے ایک نبی امی کا ظہور ہوتا ہے۔ وہ چالیس سال تک خاموش زندگی بسر کرنے کے بعد یکایک ایک نئے پیغام کی دعوت لیکر اٹھتا ہے اور اس دعوت کی سچائی کے ثبوت میں ایک کلام (قرآن) پیش کرتا ہے۔ اس کلام کو پیش کر کے وہ عرب

---

[۱] صحیح مسلم باب الاقتصاد فی الصلوٰۃ والخطبۃ

[۲] شرح زرقانی ج ۵ ص ۱۰۲

کے نامور شاعروں، شعلہ فشاں مقرروں، اور خطیبوں، اور میدانِ فصاحت و بلاغت کے شہسواروں کو ایک مرتبہ نہیں بلکہ بار بار، نرمی اور لین سے نہیں بلکہ نہایت سخت زجر و توبیخ کے انداز میں پھر یکے بعد دیگرے نہیں بلکہ سب کو ایک ساتھ چیلنج دیتا ہے کہ اگر یہ لوگ اُس کے دعوٰی کی تکذیب میں سچے ہیں تو سارے قرآن کا نہیں اُس کے کسی ایک جزء کا ہی مثل لاکر دکھا دیں!

پھر کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس نبی امی کی مخالفت اور خصومت میں کیا کچھ نہیں کہا اور کیا گیا لیکن یہ عرب کے نامور خطباء اور شعراء سب مل کر بھی قرآن مجید کی تحدی کے جواب میں اُس کی کسی ایک سورۃ کا مثل لاسکے؟ ہرگز نہیں، سب کی زبانیں گنگ تھیں۔ اور قوت فصاحت و بلاغت مفلوج، پھر جو لوگ ان میں پاک باطن اور صاف سینہ تھے اُنھوں نے کھلے لفظوں میں اپنی شکست و عجز کا اقرار کیا اور قرآن کے اعجاز بیان سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے شاعری کو ہی خیر باد کہہ دیا۔ لبید عرب کے مشہور شاعر ہیں جن کا ایک قصیدہ سبعہ معلقہ میں بھی شامل ہے، اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے شعر کہنا بالکل ترک کر دیا تھا۔ صرف ایک دو شعر منقول ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اُن سے شعر سنانے کی فرمائش کی تو اُنھوں نے جواب دیا، "جب خدا نے مجھ کو بقرہ اور آل عمران سکھائی تو اب مجھے شعر کہنا موزوں نہیں"[1]۔ ان کے علاوہ حسان بن ثابت کعب بن مالک۔ عبداللہ بن رُواحۃ۔ طفیل بن عمرو۔ زید الخلیل۔ کعب بن زُہیر۔ شماس۔ اسود بن سریع وغیرہم عرب کے نامی گرامی شعراء تھے لیکن قرآن مجید کے دعوی اعجاز کے سامنے سب کی گردنیں خم ہوگئیں اور بجائے مخالف ہونے کے اسلام کے زبردست حامی بن گئے

قرآن مجید کے اعجاز بیان کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی صاحب ذوق کے سامنے اُسکی کوئی آیت تلاوت کی جائے اور اُسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس کلام کا قائل کون ہے تب بھی لامحالہ سننے والے پر

---

[1] اسد الغابہ ج ۴ ص ۲۶۱ و ۲۶۲

اُس کا اثر ضرور ہوگا۔ تاریخ اور ادب کی کتابوں میں جستجو کی جائے تو اس قسم کے سینکڑوں واقعات مل سکتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک اعرابی نے ایک شخص سے فاصدع بما تؤمر سُنا تو فوراً سربسجود ہو گیا اور بولا: میں نے اس وقت اس کلام کی فصاحت و بلاغت سے ہیبت زدہ ہو کر سجدہ کیا ہے ایک اعرابی نے کسی شخص سے قرآن پاک کی آیت فلما استیأسوا منه خلصوا نجیاً سُنی تو بولا "میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی مخلوق اس جیسا کلام بولنے پر قادر نہیں ہے"

ایک دفعہ عربی لغت کے مشہور امام اصمعی نے ایک کمسن بچی کو دو شعر پڑھتے ہوئے سُنا شعر سنکر بولے: "اللہ اکبر! یہ شعر کس درجہ فصیح و بلیغ ہیں" لڑکی بولی: "کیا اللہ تعالیٰ کے ارشاد

واوحینا الی اُمّ موسیٰ ان ارضعیہ	اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی بھیجی کہ تم اُس کو
فاذا خفتِ علیه فالقیه فی	دودھ پلاؤ اور جب تم کو اُس کے متعلق خوف
الیمّ ولا تخافی ولا تحزنی اِنّا	ہو تو اُسے دریا میں ڈال دو اور نہ خوف کرو
رادّوہُ الیكِ وجاعِلوہُ مِنَ	نہ غم، ہم پھر موسیٰ کو تمہاری طرف لوٹا دینگے
المرسلین	اور اس کو رسول بنائینگے۔

کے بعد بھی کوئی کلام اب اسکا مستحق ہے کہ اُسے فصیح کہا جائے۔ تم دیکھتے نہیں کہ اس ایک آیت میں میں کس خوبی سے اللہ نے دو امر ارضعیہ اور القیہ دو نہی لا تخافی لا تحزنی، دو خبریں انا رادوہ اور جاعلوہ اور دو بشارتیں جمع کر دی ہیں

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ مسجد نبوی میں سو رہے تھے کہ اتنے میں روم کی فوج کا ایک کمانڈر انچیف آیا اور کلمہ تشہد پڑھنے لگا۔ حضرت عمرؓ نے اس کا سبب پوچھا تو اُس نے جواب دیا کہ میں نے مسلمان قیدیوں سے ایک قیدی کی زبانی یہ آیت سُنی ومن یطع اللہ

ورسولہٗ ویخش اللہ ویتقہ الایۃ اور اس سے اس درجہ متاثر ہوا کہ آپ کے سامنے اسلام قبول کرتا ہوں[۱]"

ان واقعات کے علاوہ صحابہ کرام کے حالات زندگی پڑھو تو معلوم ہوگا کہ قرآن مجید اُن پر کیا اثر کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے متعلق کون نہیں جانتا کہ اُنھوں نے اپنی بہن فاطمہ سے سورۃ سَبَّحَ لِلّٰہِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سُنی تو یہ حال ہوا کہ یا تو سخت غصہ میں بھرے ہوئے تھے اس سورت کو سنتے ہی ان کا حال دگرگوں ہوگیا۔ ایک ایک لفظ دل پر تیر و سناں کا کام کرتا تھا۔ یہاں تک کہ جب فاطمہ آمنوا باللہ ورسولہٖ پر پہونچی تو وہ بے ساختہ پکار اُٹھے اشہد ان لا الٰہ الا اللہ واشہد انّ محمداً رسول اللہ

حضرتِ عثمان بن مظعون نے جب سورۂ نحل کی یہ آیت سنی

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ	بے شبہ خدا عدل اور احسان اور قرابتداروں
وَاِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ	کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اور
الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ	بدکاری اور بُری باتوں اور ظلم سے روکتا ہے
لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ	تاکہ تم اُس سے نصیحت پذیر ہو۔

تو اُنھوں نے فرمایا، "اب اس وقت میرے دل میں ایمان جاگزیں ہوگیا اور میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے محبت کرنے لگا[۲]"

حضرت جبیر بن مطعم اسیرانِ بدر کو چھڑانے آئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سورۂ طور کی چند آیتیں سنی تو اُن کا دل اُڑنے لگا[۳]" حضرت طفیل بن عمرو دوسی کے کانوں

[۱] یہ سب واقعات شرح زرقانی ج ۵ ص ۱۰۳ و ۱۰۴ سے ماخوذ ہیں

[۲] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۳۱۸ [۳] صحیح بخاری تفسیر سورۂ طور

میں اتفاقیہ قرآن کی چند آیتیں پہونچ گئیں تو حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔[۵۱] حبش سے بیس آدمیوں کی ایک جماعت خدمت اقدس میں حاضر ہوئی آپ نے ان کو قرآن مجید کا ایک حصہ پڑھ کر سُنایا تو اُن کی آنکھوں سے اشک رواں ہوگئے۔[۵۲] طائف کے سفر میں حضرت خالد العدوانی نے آپ کی زبان سے

والسماءِ والطارق — آسمان کی قسم اور رات میں آنے والے کی قسم۔

سُنی تو اسی وقت پوری سورۃ دل میں اترتی چلی گئی اور آپ مسلمان ہوگئے۔[۵۳]

افراد و اشخاص کا کیا ذکر ہے صحابہ کی تو جماعت کی جماعت ہی قرآن مجید کے اثر سے متاثر ہوئی۔ حضرت ابوعبیدہ، حضرت ابوسلمہ اور حضرت ارقم بن ابی ارقم اسی کتاب الٰہی کی مقناطیسی کشش سے کھنچکر اسلام لائے تھے۔[۵۴]

پھر اسلام لانے کے بعد بھی صحابہ کا یہ حال تھا کہ ایک ایک آیت پر کلام الٰہی کی ہیبت سے آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی جو خود حامل وحی تھے بسا اوقات کسی کی زبان سے قرآن مجید سُن کر رونے لگتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے قرأت شروع کی تو چشم مُبارک سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے۔

قرآن کی یہ معجزانہ فصاحت و بلاغت اُن لوگوں کو بھی متاثر کئے بغیر نہ رہی جو اہل زبان

۵۱ طبقات ابن سعد تذکرۂ طفیل بن عمرو الدوسی

۵۲ سیرۃ ابن ہشام

۵۳ مسند امام احمد بن حنبل ج ۴ ص ۳۳۵

۵۴ اسد الغابہ تذکرہ ابوسلمہ

نہ تھے۔ اور ساتھ ہی غیر مسلم بھی تھے، ڈاکٹر ٹیلر، موسیو سدیو، گبن۔ ڈیون پورٹ۔ ٹالسٹائی۔ کارلائل ہنری دی کاستری۔ راڈویل ان لوگوں نے بھی قرآن مجید کے اسلوب بیان اور اس کی تاثیر و تسخیر کا اعتراف صاف لفظوں میں کیا ہے[۱]۔

ژان ژاک روسو نے اپنی ایک تحریر میں قرآن مجید کی تاثیر اور اس کے اعجاز کا ذکر ایک عجیب پیرایہ میں کیا ہے جو آج کل کے بعض مدعیانِ عربی دانی پر پورے طور پر صادق آتا ہے وہ لکھتا ہے:-

بعض لوگ ہیں جو عربی برائے نام ہی جانتے ہیں وہ جب قرآن پڑھتے ہیں تو ہنسنے لگتے ہیں، لیکن اگر اس قسم کے لوگوں کو اس بات کا موقع مل جاتا کہ وہ براہ راست محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس حد درجہ اثر انگیز اور دلوں میں گھر کرنے والی زبان کو سنتے تو بے شبہ یہ لوگ زمین پر سجدہ میں گر پڑتے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پکار کر کہتے کہ "اے نبی! آپ ہمارا ہاتھ پکڑ لیجیے۔ پھر آپ کا جہاں جی چاہے ہم کو لے چلیے۔ خواہ شرف و مجد کی طرف یا خطروں اور بلاؤں کی جانب۔ ہم تو اب آپ کی وجہ سے موت کو بھی محبوب رکھنے لگے ہیں۔

عدم اختلاف قرآن نے اپنے اعجاز کی ایک دلیل عدم اختلاف و تناقض کو بھی بیان کیا ہے ارشاد ہے۔

ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا[۲] — اگر قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔

عام مصنفین کی بڑی بڑی اہم تصنیفات سے قطع نظر یہ دیکھو کہ دوسرے مذاہب کی

---

[۱] دیکھو تفصیل کے لئے الاسلام والحضارۃ العربیہ جلد اوّل اور ادب العرب

[۲] بحوالہ الاسلام در محضارۃ العربیہ ج ا ص ۶۹

خود الہامی اور آسمانی کتابوں کا حشر ہوا؟ ایک اڈیشن دوسرے اڈیشن سے مختلف ہے لیکن قرآن نے اپنی صداقت میں جس دلیل کو پیش کیا تھا۔ وہ دشمنوں کی ہزار کوششوں کے باوجود آج تک آفتاب نیمروز کی طرح روشن و ظاہر ہے تقریباً تیس بتیس برس پہلے ڈاکٹر منگانا نے قرآن مجید کے کسی نئے نسخہ کے ملنے کی اطلاع سے دنیا میں ایک تہلکہ برپا کر دیا تھا۔ لیکن باخبر اصحاب کو معلوم ہے کہ مصر اور ہندوستان کے علماء نے کس طرح ڈاکٹر صاحب کے بےبنیاد دعویٰ کو باطل محض کر دکھایا تھا

احکام وشرائع

خود قرآن کے بیان کے مطابق اُس کے اعجاز کی ایک وجہ اُس کے تشریعی احکام و مسائل ہیں قرآن نے بار بار اپنے آپ کو ہدایت۔ نور۔ دلیل روشن۔ رحمت۔ بصیرت اور حجت کہا ہے۔ غور کرو قرآن مجید کے اعجاز کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ چالیس سال کی خاموش زندگی کے بعد یکایک ایک اُمّی ایک صحیفۂ مقدس لئے ہوئے دنیا کے سامنے ظاہر ہوتا ہے اور اس صحیفہ سے وہ جاہلوں کو دانشورانِ روزگار اور اونٹ چرانے والے بدویوں کو بہترین تہذیب و تمدن، اخلاق فاضلہ اور اعمالِ صالحہ کا پیکر اتم بنا دیتا ہے۔ اصولِ اخلاق و قانون حکمت و فلسفہ اور محاسنِ علم و عمل کی بزم کا گوشہ گوشہ اس کے پرتوِ قدس سے بُقعۂ نور بن جاتا ہے

قرآن کا محکم دستور العمل

جو قوانین و ضوابط قرآن نے پیش کئے وہ اسقدر صحیح اور مکمل ہیں کہ آج علوم و فنون کی بڑھی گرم بازاری اور انسانی عقل و خرد کی حیرت انگیز ترقی و بلند پروازی کے باوجود معاشرت، تہذیب و تمدن نکاح و طلاق۔ بیع و شرا، تقسیم میراث اور عام معاملات و اخلاق کے قوانین قرآنی قوانین کے مقابلہ میں سالہا سال کے تجربوں کے بعد ناکام ہی ثابت ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ دوسری قوموں کو جب کبھی اپنی سوشل اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ انھوں نے اپنی پرانی مزعومہ یا اصلی روایات مذہبی کو چھوڑ کر اسلام کے احکام و قوانین کے دامن ہی میں پناہ لی ہے۔

اس پر اگر تفصیل سے کلام کیا جائے تو ایک مستقل کتاب درکار ہے مجملاً اسقدر لکھ دینا کافی ہوگا کہ

یورپنے بہت دنوں تک طلاق کا مذاق اُڑایا۔ تعدد ازدواج پر طعنہ زنی کی۔ اور مسلمانوں کے جہاد کو وحشت اور بربریت کہا۔ مگر آخر کار اُسکو خود طلاق کا قانون وضع کرنا پڑا۔ پھر یہ دیکھو کہ اسلام نے طلاق کا اختیار مرد کو دیا تھا نہ کہ عورت کو۔ کیونکہ عورت فطرتاً بہت زود رنج اور جلد متاثر ہوجانیوالی ہو۔ یورپ والوں نے طلاق کو مشروع تو کیا لیکن غلطی یہ کی کہ اُسکا اختیار عورت کو دیدیا۔ گویا پہلے یہ لوگ تفریط میں مبتلا تھے اور اب افراط میں مبتلا ہوگئے۔ اس کا جو کچھ بھی نتیجہ ہوا آج ہر باخبر شخص اُس سے ناواقف نہیں ہے کہ طلاق کی کثرت نے کس طرح ان لوگوں کی معاشرتی زندگی ویران و تباہ کر رکھی ہے۔

ہندوؤں میں عقد بیوگان کا رواج نہیں تھا۔ مذہبی اعتبار سے وہ اسے بہت بڑا پاپ سمجھتے تھے۔ لیکن جب اس ممانعت نے اُنکی سوسائٹی میں چند در چند اخلاقی معائب پیدا کردیئے اور اُنکو اپنی اصلاح کا خیال ہوا تو انجام کار انھیں وہی کرنا پڑا جسکا اعلان اس سے ساڑھے تیرہ سو سال سے بھی زیادہ مدت پہلے ایک نبی امی کی زبان سے ہوچکا تھا۔ یہی حال میراث کا ہو۔ ہندوؤں میں بیٹی کو ترکہ پدری سے کوئی حصہ نہیں ملتا تھا لیکن اب جن ہندو ریاستوں میں سماجی اصلاح کی کوششیں ہورہی ہیں وہاں برملا کہا جارہا ہو کہ بیٹی کو بھی حصہ ملنا چاہیئے اب اسپر بھی غور کرنا چاہیئے کہ قانون قرآنی کے تناسب و متوازن ہونیکا یہ عالم ہو کہ وہ بیٹی کو باپ کے ترکہ میں سے حصہ دلاتا ہو لیکن بیٹے سے نصف، اس میں حکمت یہ ہے کہ بیٹے کو کسب معاش کے لئے کارگاہ زندگی میں تگ و دو کرنی پڑتی ہے اور تمام بار اس کو ہی اُٹھانا پڑتا ہے، رہی بیٹی تو اُسکو کمانے کیلئے خود کچھ نہیں کرنا پڑتا بلکہ اُس کا نان نفقہ شادی کے بعد شوہر کے ذمہ ہوتا ہے۔

یورپنے تعدد ازدواج پر کیا کچھ لعن طعن نہیں کیا لیکن اب خود وہاں کے بڑے بڑے حکما، اور مفکرین تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام میں تعدد ازدواج کی اجازت بہت سے اخلاقی فواحش و مفاسد کے انسداد کا کامیاب ذریعہ ہے اسی طرح یورپنے "جہاد" کو وحشت اور درندگی کہا لیکن اب دیکھو کہ خود یورپ میں کیا ہورہا ہو کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اب دبی زبان سے یورپنے بھی اس حقیقت کو تسلیم کرلیا ہو کہ جبتک دنیا فتنہ و شر، اور خواہشات نفسانی

واغراض فاسدہ کی آماجگاہ ہو کبھی حق کی حفاظت کیلئے تلوار سے کام لینا ناگوار ہے۔ البتہ ہاں فرق اسقدر ضرور ہے کہ قرآن میں جب جنگ کا حکم ہے وہ وہی جنگ ہے جو حق کی حمایت و حفاظت کیلئے لڑی جائے نسلی اور قومی عصبیت کی برتری قائم رکھنے کیلئے جنگ نہ صرف یہ کہ جائز نہیں ہے بلکہ بہت بڑی معصیت ہے اور یہاں انجیل کے پیرو جو کچھ کر رہے ہیں وہ محض اپنی قومی فوقیت کو برقرار رکھنے اور دوسرے ملکوں اور قوموں کو اپنے دام حکومت میں پھنسانے کیلئے کر رہے ہیں۔ پس غور کرو کہ کیا یہ قرآن کا اعجاز نہیں ہے کہ وہ جو دستور العمل اور نظام زندگی پیش کرتا ہے وہ ایسا جامع محکم اور ناقابل تغیر و تبدل ہے کہ صدیوں کے گذر جانے اور عقل و فکر کی حیرت انگیز ترقی کے باوصف اسکی کسی ایک دفعہ میں بھی کوئی ترمیم و تنسیخ نہیں ہو سکتی۔ اور اس بنا پر مسلمان اس بات کے محتاج نہیں ہیں کہ اپنی کسی سوشل اصلاح کیلئے وہ کسی دوسرے قانون و نظام سے دریوزہ گری کریں تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی کسی جماعت نے قرآن کے دستور سے منحرف ہو کر کسی قوم کی نقالی کی اس نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں۔ اسکے برعکس دوسری قوموں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی سوسائٹی کی اصلاح کیلئے جب کبھی غور و فکر سے کام لیتی ہیں انھیں مجبوراً اپنی دیرینہ روایات مذہبی و سماجی کو پس پشت ڈال کر اسلام کے دستور سے ہی بھیک مانگنی پڑتی ہے۔ پس کیا کوئی طاقت ہے جو قرآن کے دعویٰ

کتاب احکمت آیاتہٗ	ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں مضبوط ہیں
اور جعلناہٗ نوراً نھدی بہٖ من نشاءُ	ہم نے اسکو نور بنایا ہے کہ جسکو چاہتے ہیں اسکے ذریعہ سے راستہ دکھاتے ہیں

کی ذرا بھی تکذیب و تغلیط کر سکے، سورہ قصص میں قرآن مجید اپنی اس حیثیت کو بطور تحدی اس طرح بیان کرتا ہے

قل فاتوا بکتابٍ مِن عِندِ اللّٰہِ	کہدیجئے اے محمد اتم اللہ کے پاس سے کوئی ایسی
ھُوَ اھدیٰ منھما اتبعہٗ ان کنتم	کتاب لے آؤ جو ان دونوں (قرآن اور توراۃ)
صادقین	سے زیادہ ہدایت دینے والی ہو۔ میں اس کا

قرآن کی روح سے تشبیہ | جیسا کہ شروع میں بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید سراپا نور اور حسن و جمال ہے سطور بالا میں جو چند وجوہِ اعجاز بیان کئے گئے ہیں وہ صرف اس کے ایک رُخ پر نور کی ناتمام سی تشریح کرتے ہیں غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کو ایک مقام پر روح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے

وکذالک اوحینا الیک روحًا من امرنا (زخرف) — اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے آپ پر روح کو بطور وحی نازل کیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح روح ایک حقیقت ثابتہ ہے اسکے افعال و آثار ہر شخص پر عیاں ہیں اور یہ بھی سبکو معلوم ہے کہ مادی اور جسمانی زندگی کا قیام روح کے اتصال بالجسم پر موقوف ہے لیکن اسکے باوجود آج تک روح کی حقیقت و ماہیت متعین نہیں کی جاسکی۔ اسی طرح قرآن مجید اخلاق و حسنِ عمل کی روح ہے اس پر عمل کرنے کے بعد ہر شخص اس کے اثرات و نتائج بین طور پر محسوس کر سکتا ہے۔ لیکن با ایں ہمہ کوئی شخص اُس کی پوری حقیقت و کنہ سے واقفیت حاصل نہیں کر سکتا۔

حضرت علیؓ کا ارشاد | حضرت علیؓ نے قرآن مجید کی نسبت ایک نہایت بلیغ کلام کیا ہے ہم وجوہ اعجاز کی بحث کو اس پر ہی ختم کرتے ہیں۔

"قرآن علماء کی پیاس کیلئے سامان سیرابی ہے اور فقہا کے دلوں کے لئے فصل بہار، وہ صلحاء کیلئے ایک جادۂ مستقیم ہے اور ارباب بحث و نظر کیلئے برہان قوی، وہ طلبۂ علوم کیلئے علم کا انمول خزانہ ہے اور ارباب حکومت کے واسطے ایک محکم دستور اساسی، وہ اصحاب روایت کے لئے حدیث جانفزا ہے اور تشنگانِ تحقیق و جستجو کے لئے اُمید و رجاء کا سب سے بڑا سہارا (نہج البلاغۃ)

حق کی حجت تمام ہو چکی، اب اس پر بھی اگر کوئی سرگشتہ وادیِ ضلالت و گمرہی ہدایت کی روشنی نہیں پاتا تو نہیں کہا جا سکتا کہ

فبایِّ حدیثٍ بعدہٗ یؤمنون[1] — اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے

[1] یہاں پر بتادینا ضروری ہے کہ ہم نے کتاب کے موضوع بحث کی مناسبت سے اعجاز قرآن پر مختصر گفتگو کی ہے۔ ورنہ اس بحث کے لئے ایک مستقل ضخیم کتاب درکار ہے۔ عربی میں خاص اسی موضوع پر کئی عمدہ اور مفصل کتابیں موجود ہیں۔

قرآن مجید کا اسلوب بیان اور بعض عیسائی مصنفین

کتاب کے آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض اُن اعتراضات اور اُنکے جوابات کا بھی ذکر کردیا جائے جو بعض عیسائی مصنفین نے قرآن پر کئے ہیں۔ ان لوگوں کا ایک عام اعتراض یہ ہے کہ نزول قرآن سے پہلے عرب میں بعض پرزور خطیب مثلاً قس بن ساعدہ، اور شعراء مثلاً امیۃ بن الصلت ایسے موجود تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے اُنکے خطبے اور اشعار سُنے تھے۔ اور ان لوگوں کے کلام میں بعض چھوٹے چھوٹے فقرے قرآن کی چھوٹی چھوٹی آیتوں کے انداز کے پائے جاتے ہیں، عیسائی مصنفین اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کا اسلوب انھیں سے لیا ہے

قس بن ساعدہ کے خطبات۔ اور امیۃ بن الصلت کے اشعار عربی ادب و محاضرات کی کتابوں میں بکثرت منقول ہیں اُنکی طرف مراجعت کیجاسکتی ہے یہاں اُنکے نقل کرنیکی ضرورت نہیں۔ اس اعتراض کے جواب میں سب سے پہلے یہ معلوم کرلینا چاہئے کہ قس بن ساعدہ اور امیۃ کے جن اشعار کو پیش کر کے قرآن مجید کے اسلوب پر اعتراض کیا جاتا ہے اُن کی نسبت تحقیق یہ ہے کہ وہ سب موضوع ہیں۔ اس بنا پر وہ نزول قرآن سے پہلے کا نہیں بلکہ بعد کا کلام ہے اصل یہ ہے کہ بنو امیہ اور عباسیہ کے عہد میں کچھ ایسے لوگ تھے جو خلفاء و امراء سے بیش از بیش انعام حاصل کرنے اور بعض دوسری اغراض کیلئے از خود کلام گھڑ گھڑ کر شعراء و خطباء جاہلیت کی طرف اسے منسوب کر کے سُنا دیتے تھے۔ ان وضاعین میں حماد الراویۃ اور خلف بن حیان الاحمر زیادہ مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ ولید بن یزید نے حماد سے پوچھا "تمھیں کتنے اشعار یاد ہیں" بولا "بہت زیادہ۔ اگر آپ سُننا چاہیں تو ایک نشست میں ہی ہر ہر حرف تہجی کے سو سو طویل قصیدے صرف شعراء جاہلیت کے سُنا سکتا ہوں" ظاہر ہے کہ حماد کا یہ عجیب و غریب دعویٰ خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ شعراء جاہلیت کی طرف منسوب کرکے جو اشعار سناتا تھا ان میں بہت کچھ اُسکے خود ساختہ و پرداختہ اشعار بھی شامل ہوتے ہونگے۔ چنانچہ اصمعی نے ایک مرتبہ کہا "حماد اعلم الناس ہے۔ اگر وہ اشعار میں کمی بیشی نہ کرے" علامہ یاقوت الحموی لکھتے ہیں کہ

اصمعی نے یہ اسلئے کہا کہ حماد کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ وہ شعر از خود کہتا ہے اور پھر شعراء عرب کی طرف اسے منسوب کر دیتا ہے[۵۱] "مفضل الضبی کا قول ہے، "شعر پر حماد کی وجہ سے ایسی آفت ٹوٹی ہے جسکی کبھی اصلاح نہیں ہوسکتی، یہ شخص قدیم شاعروں کے محاورات. انداز بیان اور ان کے لغات و اسلوب ادا سے پوری طرح واقف تھا۔ اسلئے ان کے ہی طرز میں شعر کہہ کر انکی طرف منسوب کر دیتا تھا۔ اور سوائے ماہر فن نقاد کے عام لوگوں کو امتیاز نہیں ہوسکتا تھا کہ اس قصیدہ میں کتنے شعر شاعر کے ہیں اور کتنے خود حماد کے کہے ہوئے ہیں[۵۲]" ۱۵۵ھ میں انتقال ہوا۔

یہی حال خلف الاحمر کا تھا، اس کا باپ ابو بردہ بلال بن ابی موسٰی الاشعری کا غلام تھا، اشعار کے وضع میں یہ حماد کا ہم پایہ تھا۔ کتاب "اخبار الرواۃ" میں ہے کہ یہ شخص اتنا بڑا حاذق اور ماہر لغت و ادب تھا کہ اپنے اشعار شعراء جاہلیت کے نام سے پڑھ کر سنا دیتا تھا۔ اور بڑے بڑے زباں دانوں کو یہ محسوس نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ اشعار خود اُسکے طبع زاد ہیں، ابو الطیب عبد الواحد اللغوی کا بیان ہے۔

کانَ خَلَفٌ یضع الشعر وینسبُہٗ	خلف اشعار وضع کرتا تھا اور انھیں عرب کی طرف
الیٰ العربِ فلا یُعرَفُ[۵۳]	منسوب کر دیتا اور (لطف یہ ہے) اسکا پتہ نہیں چلتا تھا

ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ چونکہ قرآن نے اپنی غیر معمولی فصاحت و بلاغت کے باعث تمام عرب کے دلوں کو مسخر کر لیا تھا۔ بچہ بچہ کی زبان پر قرآن کی آیتیں تھیں جنھیں بے تکلف بول چال۔ اور تقریر و خطابت میں استعمال کر کے اپنے کلام کو مزین کرتے تھے۔ انداز خیال۔ اسلوب بیان اور طرز کلام و گفتگو سب قرآن مجید کے نظم کلام سے متاثر تھے اس بنا پر یہ قیاس کرنا بالکل صحیح ہے کہ حماد الراویہ اور خلف الاحمر ایسی وضع و قماش کے لوگ اپنے جن نتائج فکر کو قدیم شعراء عرب کی طرف منسوب کرتے تھے

[۵۱] معجم البلدان ج ۱۰ ص ۲۶۵ جدید اڈیشن
[۵۲] ایضاً ص ۲۶۵، ۲۶۶
[۵۳] معجم البلدان ج ۱۱ ص ۶۸

اُن میں قرآن مجید کے اسلوب بیان کی جھلک اضطراری یا اختیاری طور پر نمایاں ہو جاتی تھی ہم تمثیلاً تین شعر نقل کرتے ہیں جو بالعموم امیۃ بن الصلت کی طرف منسوب ہیں۔ انھیں پڑھو اور غور کرو صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے قرآن مجید سامنے رکھ کر یہ اشعار تصنیف کئے ہیں۔

فقلت لہ اذہب بھارون فادعوا ۔۔۔ الی اللہ فرعون الذی کان طاغیا
وقولا لہ انت رفعت ھذہ ۔۔۔ بلا عمدٍ ارفق اذا ابک بانیا
وقولا لہ انت سوّیت وسطہا ۔۔۔ منیراً اذا ما جنّہ اللیل ہادیا

ان اشعار کے ساتھ قس بن ساعدۃ کے خطبہ کا ایک ٹکڑا بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔ کہتا ہے۔

"نبیا قد حان حینہ، واظلکم اوانہ، فطوبیٰ لمن آمن بہ فہداہ وویل لمن خالفہ وعصاہ"[1]

جو لوگ زبان عربی کا ذوق رکھتے ہیں وہ فوراً محسوس کرلیں گے کہ اس عبارت میں جو الفاظ قرآن مجید کے آگئے ہیں ان کا دوسرے الفاظ کے ساتھ جوڑ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ٹاٹ میں مخمل کے کسی ٹکڑے کا پیوند، اور اس بنا پر پوری عبارت صاف بتارہی ہے کہ یہ نزول قرآن سے پہلے کی نہیں بلکہ بعد کی ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ پروفیسر مارگولیوتھ اس قسم کے معترضین میں سب سے پیش پیش ہیں مگر ایک جگہ خود انھیں بھی اعتراف ہے کہ "قدیم شاعری کا اکثر حصہ قرآن کے اسلوب پر موضوع کیا گیا ہے"[2]

اشعار موضوعہ کی تنقید | جس طرح مسلمانوں میں بعض شریر النفس لوگوں کی کوششوں سے احادیث موضوعہ کا چرچا ہوا تو ارباب فن نے اُن کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا اور ایک ایک لفظ اور ایک راوی پر ایسا نقد و جرح کیا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوگیا۔ اسی طرح اس قسم کے من گھڑت اشعار

---

[1] اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ للسیوطی ج ۱ ص ۲۸ مطبوعہ مصر

[2] بحوالہ سیرۃ النبی ج ۱ حاشیہ صفحہ ۱۸۳

اور خطبے شعرار و خطبار قدیم کی طرف منسوب ہو کر مسلمانوں میں پھیلنے شروع ہوئے تو اگرچہ عوام اصلی اور نقلی میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اصحاب ذوق اور علمار شعر و ادب اس فریب میں نہیں آسکتے تھے انھوں نے علمار جرح و تعدیل کی طرح ان موضوع اشعار و قصائد کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا، اور جس میں جہاں کہیں رخنہ نظر آیا اُسے برملا ظاہر کیا۔ چنانچہ ابن ہشام نے اپنی سیرت میں اور جلال الدین سیوطی نے اللآلی المصنوعہ میں اس نوع کے اشعار و خطبات متعدد مواقع پر نقل کر کے ان پر تنقید کی ہے اور اُن کے موضوع ہونے کا پردہ چاک کیا ہے۔ ان کے علاوہ عربی ادب کی تنقیدی کتابوں میں بھی اس طرح کے مقولے اور اقوال بکثرت مل سکتے ہیں

پھر اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اگر عیسائی مصنفین کا یہ اعتراض کسی درجہ میں بھی درخور اعتنا ہوتا تو اس کی طرف سب سے پہلے توجہ اُن کفار و مشرکین کو ہوتی جو انتہائی عالم بے لبسی و بیکسی میں قرآن پر حرف گیری کرنے کے لئے تنکے کا سہارا ڈھونڈتے تھے۔ تو پھر کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ جو لوگ اہلِ زبان تھے شعرار جاہلیت کا کلام جن کے ایک ایک بچہ کی زبان پر تھا اور جو عربی زبان کے اسالیب بیان سے واقف ہونے کے باعث شعرار عرب پر بہترین تنقید کر سکتے تھے اُن کے حاشیہ خیال میں تو یہ بات کبھی بھی نہیں آئی کہ قرآن مجید کا اسٹائل شعرار و خطبار جاہلیت کے اسٹائل سے ماخوذ ہے اور وہ عیسائی مصنفین جن کا ذوقِ عربیت اور مسلمانوں کے فنِ روایت سے اُن کی واقفیت برائے نام ہی ہے وہ اس بے سر و پا اعتراض کی جرأت کرتے ہیں سبحان اللہ!

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمۂ و ناز
بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

DUE DATE

10 MAR 87

JA 29 '82

OCT 1987